رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۶۳ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ۶۵ پیسے

ہر مُسلمان کے لیے قابلِ مطالعہ کُتب

محسنِ انسانیتؐ

مؤلفہ: ابوالسلام نعیم صدیقی

- ○ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر مستند اور جامع کتاب —— ایک نئے انداز میں۔
- ○ حضورؐ کی ہمہ گیر شخصیت کا تحریکی نقطۂ نظر سے مطالعہ۔
- ○ پیغمبرانہ بصیرت، تدبّر و حکمت کی آئینہ دار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۰۰ ۔ ۱۵ روپے سستا ایڈیشن ۰۰ ۔ ۱۱ روپے

حیاتِ طیبہ

اثر: ابوسلیم محمد عبدالحی

- ○ نبی اکرمؐ کی سیرتِ پاک آسان اور عام فہم انداز میں۔
- ○ مستند واقعات، ایمان پرور جذبات سے بھرپور۔
- ○ حضورؐ کی قیادت میں برپا شدہ تحریک کا مختصر مگر جامع نقشہ۔
- ○ ایمان و عمل پر اُبھارنے والی ایک بیش قیمت کتاب۔

صفحات ۲۸۰ قیمت ۵۰ ۔ ۳ روپے

ختمِ نبوّت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ○ ختمِ نبوّت کے بارے میں ۱۴ صدیوں کے جیّد علماءِ اُمّت کی متفقہ تصریحات۔
- ○ مُنکرینِ ختمِ نبوّت کے اعتراضات کا مدلّل جواب

آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت

اعلیٰ ایڈیشن خوبصورت سرورق ۶۰ پیسے

سستا ایڈیشن فی نسخہ ۲۰ ″

قادیانی مسئلہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اور اُسکے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلو

- ○ پاکستان میں قادیانیت کے اثرات۔
- ○ قادیانی عقائد کا دینی، سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے جائزہ
- ○ قادیانیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

قیمت مجلّد ۷۵ ۔ ۵ روپے

سستا ایڈیشن ۷۵ ۔ ۳ ″

مُرتد کی سزا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی قانون میں

- ○ اسلامی قانون میں ارتداد کی نوعیت و حیثیت
- ○ اسلام کے ایک اہم قانون کی تشریح مضبوط دلائل کے ساتھ
- ○ مخالفین کے اعتراضات اور اُن کے مُسکت و مدلّل جوابات

آفسٹ کی حسین طباعت قیمت ایک روپیہ

تجدید و احیائے دین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ○ تجدید دین کی حقیقت اور اس کی اہمیت
- ○ مجددینِ ملت کے کارناموں کا تحقیقی مطالعہ
- ○ تجدد اور تجدید کا فرق۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت

قیمت مجلد ۷۵ ۔ ۲ روپے سستا ایڈیشن ۷۵ ۔ ۱ روپے

فون = ۶۸۳۴۱

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ○ ۱۳ - ای شاہ عالم مارکیٹ ○ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	مئی ۱۹۶۵ء	جلد ۶۳

قیمت فی پرچہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	سالانہ چندہ
۷۵ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور	سات روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

کراچی سے ہمارے ایک کرم فرما نے ہمیں مندرجۂ ذیل خط تحریر فرمایا ہے:

"ترجمان القرآن اپریل ۱۹۶۵ء نظر سے گزرا۔ اشارات میں آپ نے صفحہ ۴ پر لکھا ہے:

"جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی اور اجتماعی زندگی میں جتنی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں لانے کی آرزومند ہوگی اتنے ہی اس کے عزائم وسیع اور مزاج آمرانہ ہوگا۔"

اگر آپ اس اصول کی صحت پر یقین رکھتے ہیں تو ایک سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک انقلاب لانا چاہتی ہے اور اجتماعی زندگی میں ایک تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے اس صورت میں جماعت اسلامی اور اس کی قیادت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عین اسی اصول کے مطابق جب کچھ حضرات جماعت کے مزاج اور اس کی قیادت کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں تو پھر آپ کو بجائے جواب دینے اور مدافعت کرنے کے فراخ دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ توقع ہے کہ جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں گے۔"

اس خط کا ایک نہایت مختصر جواب بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن جماعت اسلامی کی قیادت کے بارے میں چونکہ مختلف حلقوں میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے اس لیے ہم اس معاملہ پر پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ جن ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہو گئے ہیں وہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

جہاں تک میری اس عبارت کا تعلق ہے کہ جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی ہوگی اتنے ہی اس کے

عزائم وسیع اور اس کا مزاج آمرانہ ہوگا، اس کے بارے میں میری درخواست یہ ہے کہ براہِ کرم میری
ان معروضات کو اُس سیاق وسباق میں رکھ کر ملاحظہ فرمائیں جس میں میں نے یہ بات کہی ہے۔ میں ذکر
یہ کر رہا تھا کہ مسلمان بحیثیت ملت اُن اقدارِ حیات کو اپنانے کے لیے ابھی تک آمادہ نہیں ہو رہے
جو مغرب اُن پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے مشرقی ممالک
میں جمہوریت کے بجائے آمریت کو پروان چڑھانے کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے اور ایک مختصر
سے مغرب زدہ طبقے کو، جو دینِ مغرب پر نہ صرف دل وجان سے ایمان رکھتا ہے بلکہ مسلمان ممالک
میں اس کا تسلط قائم کرنے کا بھی متمنی ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے آلۂ کار بنا رہا ہے۔ ظاہر
بات ہے کہ اس طبقے کی سیادت جمہوریت کے ذریعہ تو قائم نہیں کی جاسکتی، اس لیے اہلِ مغرب مشرق
میں ہر جگہ، اور خصوصاً مسلمان ملکوں میں آمریت کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ اُن کے یہ عزائم مسلمانوں
کے لیے جتنے خطرناک ہوں گے، انہیں ان سے اتنی ہی وحشت ہوگی، اس لیے اُن کی تکمیل کی اگر کوئی
صورت ممکن ہے تو وہ صرف یہ کہ یہاں بالجبر مغرب کے نظامِ حیات کو نافذ کیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ
چیز عوام کی رائے پر چھوڑ دی جائے تو اس کی کامیابی کے امکانات بہت تاریک ہو جاتے ہیں
مسلمان قوم کے اندر ان مادّی اقدار کو اتارنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور یہ قوم اتنی بیوقوف بھی
نہیں ہے کہ جان بوجھ کر آبِ حیات کے بجائے زہر کو شوق اور رغبت کے ساتھ اپنے حلق میں اتارنے
پر آمادہ ہو جائے۔ وہ اگر آج دین سے برگشتہ نظر آ رہی ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے پر تیار
نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس "شہادت گہِ الفت" میں قدم رکھنے کی قیمت ادا نہیں کر
سکتی۔ اُسے اسلام سے محبت اور عقیدت ضرور ہے اور وہ اسے ہر دوسرے نظام کے مقابلے
میں قابلِ ترجیح سمجھتی ہے لیکن ماحول نے اسلام کے لیے جس طرح حالات کو ناساز گار بنا رکھا ہے
اُس سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کے اندر جذبہ اور ولولہ باقی نہیں رہا۔ اگر اقتدار قوت و
طاقت سے کام لے کر دیدہ و دانستہ اسلام کے لیے ناقابلِ برداشت مشکلات پیدا نہ کرے تو مسلمان
اسلام کی عملداری کو بخوشی قبول کریں گے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا کی جو قوم یا قیادت مسلمانوں کے

اندر اُن کی پسند اور مرضی کے علی الرغم کوئی ایسا نظامِ حیات مسلط کرنے کا داعیہ رکھتی ہو وہ اپنے ان انقلابی عزائم کو آمریت کے ذریعہ ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔

میری یہ گذارش ہر قیادت کے بارے میں ایک عام اصول کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کا تعلق مسلمان ممالک کی موجودہ صورتِ حال سے ہے، اور اس کی صحت کو ہر وہ شخص پوری طرح جان سکتا ہے جو مسلمان ممالک کے حالات پر کچھ بھی نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کی صراحت مَیں نے زیرِ بحث مضمون میں صفحہ ۴ اسے آگے پُوری طرح کر دی ہے۔

باقی رہا جماعت اسلامی اور اس کی قیادت کے آمرانہ مزاج کا مسئلہ تو اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات جماعت اور اس کے قائدین پر آمریت کا الزام لگاتے ہیں وہ یا تو جماعت اور اُس کے نظام کے بارے میں کوئی معمولی واقفیت بھی نہیں رکھتے، یا وہ کسی شدید غلط فہمی میں گرفتار ہیں۔ جو شخص بھی جماعت کے متعلق کوئی براہِ راست معلومات رکھتا ہے، یا اُس کے دستور پر اُس نے کبھی اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالنے کی تکلیف گوارا کی ہے وہ جماعت کے بارے میں اتنی غلط بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔

اس مسئلہ کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آمریت کا خمیر کن عناصر سے اٹھایا جاتا ہے اور آمریت کس مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو جنم دیتی ہے اور اس سے انسان کس نوعیت کی روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

آمریت درحقیقت ایک روگ ہے جو اقتدار اور عز و جاہ کی ایک نہ مٹنے والی ہوس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ عارضہ اپنی بالکل ابتدائی منزل میں قطعاً خطرناک دکھائی نہیں دیتا، بلکہ اگر اس کا تجزیہ کرتے چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز بہت سے دوسرے روحانی عوارض کی طرح انسان کی ایک فطری اور معصوم خواہش سے ہوتا ہے جو اوّل قدم پر ہی ایک غلط رُخ اختیار کرنے کی وجہ سے انسان کو تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ انسان کو اپنی

رائے کا کتنا احترام ہوتا ہے۔ یہ احساس بالکل فطری ہے، کیونکہ انسان اگر اپنی رائے کو خود ہی بے وزن سمجھنے لگے تو پھر نہ تو اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے، نہ وہ اپنی رائے کے مطابق کوئی عملی قدم اٹھا سکتا ہے، اور نہ اس رائے کو دوسرے کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ جس چیز کی صحت کے بارے میں انسان کو خود ہی کوئی یقین اور وثوق نہ ہو وہ چیز آخر اُس کے عمل کا محرک کس طرح بن سکتی ہے۔ اپنی رائے کے اس احترام میں بذاتِ خود کوئی قباحت نہیں، اور اگر یہ جذبہ اپنی فطرت کے حدود کے اندر رہے تو اس سے فرد اور معاشرے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن یہی معصوم سا جذبہ جب اپنی فطری حدود سے تجاوز کر کے خود پسندی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس سے فرد اور معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی جذبہ کی غلط صورت انسان کے قلب و دماغ میں اس باطل خیال کی آبیاری کرتی ہے کہ اُس کا ذہن سچائی کا واحد سرچشمہ ہے، جو چیز بھی اس منبع سے نکلتی ہے وہی بالکل برحق اور صحیح ہے اور اس کے مقابلے میں ہر دوسرے دماغ کی سوچی ہوئی تدبیر لازمی طور پر غلط اور احمقانہ ہے۔ اس طرح اپنی رائے کے احترام کا وہی پاکیزہ اور فطری جذبہ، جو جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی فرد کی شخصیت کے نشوونما کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، غلط صورت اختیار کرنے کے بعد خود پسندی، خود رائی اور استبداد جیسے خوفناک مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس شخص کی انانیت اپنے سامنے کسی دوسرے کو گوارا ہی نہیں کر سکتی۔ اُس کے اندر تکبر اور نخوت کے جراثیم پلنے لگتے ہیں۔ وہ ہر وقت دوسروں کی تضحیک و تذلیل کے درپے رہتا ہے اور شعوری اور غیر شعوری طور پر ان پر چوٹیں لگا کر اپنی انانیت کی تسکین کا سامان کرتا ہے، مگر خود اپنے بارے میں اتنا حساس ہو جاتا ہے کہ کسی معمولی اختلاف یا کسی نرم سے نرم تنقید کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی ایک جملہ بھی وہ اپنی شان کے خلاف سنتا ہے تو اس کی انانیت فوراً بپھر کر انتقام لینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ جب تک اس جسارت کا ارتکاب کرنے والے کو بالکل برباد نہ کر دے اُس وقت تک اُسے سکون حاصل نہیں ہوتا۔ اور اُس کے معتوب کو اگر تکلیف پہنچی ہے

تو خود دلپسند انسان اُس میں گونا گوں لذت محسوس کرتا ہے ۔ یہ عمل جب مدت تک کام کرتا رہتا ہے تو اس سے اس کی پوری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے ۔

انانیت اور آمریت ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم عناں ہو کر آگے بڑھتی ہیں ۔ آمریت کے اردگرد خود فریبی کی جتنی بیشمار تہیں چڑھی ہوئی ہیں انہیں اگر ہٹا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ روگ ابتدائی صورت میں انانیت کی طرح کسی اعتبار سے خطرناک نہ تھا ۔ بلکہ محض غلط رُخ اختیار کرنے کی وجہ سے تباہ کن ثابت ہوا ۔ اس کی اصل صرف اسی قدر ہے کہ دنیا کا ہر فرد چونکہ الگ الگ شخصیت رکھتا ہے اس لیے اس کے حفظ و بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کے استحکام کا سامان کرے ، کیونکہ اگر وہ اسے مستحکم کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ سبکدوش نہیں ہو سکتا ۔ تعمیرِ شخصیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں نہ صرف اپنے مرتبہ و مقام کو مشخص کرے بلکہ اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بھی سرگرم عمل رہے ۔ معرفتِ ذات صرف اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس نہیں بلکہ انہیں دُور کرنے کے لیے فکر و اضطراب ، اور فرد اور معاشرے ، معاشرے اور کائنات اور اس کے خالق اور مالک کے ساتھ لاتعداد رشتوں کے اندر اس کے اپنے مقام کی صحیح پہچان ہے ۔

ایک شخص اگر اس وسیع و عریض کائنات کے اندر اپنے مقام کی صحت کے ساتھ نشاندہی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ صرف فرد اور معاشرے کی ہی نہیں ، بلکہ پوری کائنات کی بڑی خوش قسمتی ہے ۔ اصل مصیبت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ اپنے حقیقی مرتبے اور مقام سے تجاوز کر کے نہ صرف اپنے ابنائے جنس کے جائز حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے بلکہ خالق اور مالک کے حقوق پر بھی دست درازی شروع کر دیتا ہے ۔ اپنی ذات کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات اور دوسروں کے حقوق کے غصب کرنے کا رجحان ایک نفسیاتی بیماری ہے جو آمرانہ ذہنیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔

اس بیماری کی وجہ سے انسان کے اندر خود پسندی اور اپنی قابلیت کا حد سے بڑھا ہوا پندار اُبھرتا ہے اور وہ شخص معاشرے سے وہ مراعات طلب کرتا ہے جس کا وہ کسی اعتبار سے بھی مستحق نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ غلط خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کا مرکز ہے اور نوع بشری اور اُس کے سارے وسائل محض اس کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ صحیح اور برحق وہ چیز ہے جسے اس کا ذہن صحیح اور برحق سمجھے اور باطل وہ ہے جسے اس کا دماغ باطل قرار دے۔ اُس کی ذات کے سوا معاشرے میں کسی دوسرے انسان کے کوئی مستقل حقوق نہیں ہیں، بلکہ دوسرے انسانوں کے وجود کی غایت صرف اسی کی خدمت اور چاکری ہے۔

یہ غلط خیال اگر محض خیال کی دنیا تک محدود ہو تب بھی نتائج کے اعتبار سے بڑا خطرناک ہے، لیکن جب یہی خیال عملی صورت اختیار کرتا ہے تو اس سے پوری معاشرتی زندگی کا سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان اپنے فطری حقوق سے آسانی کے ساتھ دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہوتے، اس لیے جبر اور سازش کے ذریعہ انھیں ان سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چنانچہ اگر یہ بات کہی جائے کہ آمریت کا قصر صرف جبر کی بنیاد پر تعمیر کیا جاتا ہے اور سازش اس میں چونے اور گارے کا کام دیتی ہے تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ آپ ماضی وحال کے کسی آمرانہ نظام کا تجزیہ کریں تو آپ کے سامنے یہ حقیقت بالکل کھل کر آجائے گی کہ سازش سے اس نظام کا آغاز ہوا، جبر واستبداد نے لوگوں پر اسے مسلط کیا، اور جوڑ توڑ، جھوٹ اور فریب کے ایک وسیع سلسلہ نے اس کے تسلط کو کچھ دیر تک قائم رکھا۔

یہ نظام چونکہ ایک فرد کی حد سے بڑھی ہوئی حرص کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے یہ سارا نظام محض اُسی ایک شخصیت کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس امر کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے کہ اس مرکزی شخصیت کو مافوق البشر ثابت کیا جائے۔ انسانوں کے دل ودماغ جب تک اُسے ایک غیر معمولی ہستی تسلیم نہیں کرتے اس وقت تک وہ اپنے حقوق

سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر وہ اُسے اپنے جیسا ایک عام انسان سمجھ لیں تو پھر وہ اسے منزہ عن الخطا کس طرح مان سکتے ہیں اور اس کی ہر بات کو بلا چون وچرا کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں تو وہ اُس کے کارناموں پر کھلے بندوں نقد و جرح کریں گے اور اس کی غلطیوں پر اُسے ٹوکیں گے۔ اسی بنا پر آمریت کے لیے سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ غلط پراپیگنڈے کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں کو بالکل ماؤف کر دیا جائے۔ اور اُن کے اندر سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے۔ وہ جدھر بھی نگاہ دوڑائیں انہیں آمر کی ذات کے سوا کوئی دوسری شخصیت نظر نہ آئے، اور اُن کے دماغ میں یہ غلط خیال بالکل راسخ ہو جائے کہ اُن کا سربراہ مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مالک ہے اور اُس کی سربراہی میں ہی قوم اور ملک کی فلاح مضمر ہے۔ اُس کی اگر کسی بات کو رد کر دیا گیا تو اس کی صدیوں تک تلافی ممکن نہ ہو گی۔ جو لوگ اُس کے کارناموں کے خلاف تنقید کرتے ہیں وہ وطن اور قوم کے دشمن ہیں، عوام الناس کی فلاح و بہبود ان کو گوارا نہیں ہے، اور وہ خلوص اور دیانت داری سے یکسر عاری ہیں۔ اُن کی تنقید میں خیر کا کوئی پہلو نہیں اور اس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ انسانیت کے اس "نجات دہندہ" کی خدماتِ جلیلہ سے قوم اور وطن کو محروم کر دیا جائے۔

ایک طرف قوم کے قلب و دماغ میں اس قسم کے باطل خیالات کی پرورش کا سامان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ سربراہ صاحب اس نوعیت کی کارگذاریوں میں مصروف رہتے ہیں جن سے اُن کی شخصیت کا بھرم کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے چن چن کر اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کرتے ہیں جو ذہنی استعداد، اخلاق و عادات اور سیرت و کردار کے اعتبار سے قوم میں مقبول نہ ہوں، تاکہ ان کے ہالے میں "آمر" کی شخصیت غیر معمولی طور پر نمایاں ہو سکے۔ آج تک کسی آمر نے بھی اپنی رفاقت کے لیے ایسے افراد کا کبھی انتخاب نہیں کیا جو سیرت کے لحاظ سے مضبوط اور اپنی قوم کے اندر عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جانے والے

ہوں۔ ایک آمر کو اُنہی لوگوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کا اپنا کوئی ماضی نہ ہو، جو اپنے اس اعزاز و اکرام کے کسی طرح مستحق نہ ہوں، بلکہ اس کے لیے سراسر آمر کی چشم کرم کے محتاج ہوں جنہیں اقتدار جس وقت چاہے بیک بینی و دو گوش نکال باہر پھینکے اور اُن کے اس انجام پر کسی کی زبان سے کوئی حرفِ تاسف ادا نہ ہو۔

پھر اس نظام کے حفظ و بقا کے لیے ایک عام قاعدہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ معاشرے کے اندر مفادات کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزیرے بنا دیئے جائیں اور باقی سوسائٹی کو زیردست آزاری اور ظلم و تشدد کے طوفانوں کی نذر کر دیا جائے تاکہ عوام ان جزیروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوں اور اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اُن کو کبھی خیر باد کہنے کی جسارت نہ کر سکیں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، دنیا کے جتنے آمرانہ نظام مختلف شکلوں میں دنیا کے نقشے پر ابھرے ہیں۔ اُن میں مفادات کے اِن جزیروں کا قیام بالکل ناگزیر دکھائی دیتا ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا نظام سمٹ کر صرف انہی جزیروں تک محدود ہو گیا ہے۔ "آمریت اصول اور عمل میں" (DICTATORSHIP IN THEORY AND PRACTICE) کے فاضل مصنف نے اسی ضمن میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ آمرانہ نظام کے اندر مختلف سیاسی ادارے اور پارٹیاں جس انداز سے تشکیل پاتی ہیں وہ جمہوری نظام سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ جمہوری نظام میں ان اداروں اور جماعتوں کی قوت و طاقت کا سرچشمہ رائے عامہ ہے اس لیے ان کی جڑیں عوام کے اندر جتنی گہری ہونگی اتنی ہی وہ طاقتور اور توانا ہونگی۔ مگر آمرانہ نظام میں ان کی حیثیت ایک ایسے درخت کی سی ہوتی ہے جس کی کوئی جڑ نہ ہو، اور اُسے اوپر سے معاشرے میں نصب کرنے کی کوشش کی جاتے۔ ان اداروں اور جماعتوں کے اندر اُس وقت تک زندگی کے آثار رہتے ہیں جب تک اقتدار کا ابرِ کرم ان پر مسلسل برستا رہے۔ لیکن جس لمحہ اقتدار آنکھیں پھیر لے اسی وقت ان پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ اسی موضوع پر ابھی حال ہی میں JOHN STRACHEY کا ایک بڑا فکر انگیز مضمون THE CHALLENGE OF DEMOCRACY

کے نام سے انگلستان کے ایک مشہور رسالے میں شائع ہوا ہے۔ یہاں ہم اُس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن میں آمرانہ نظام کی خصوصیات کا بڑی عمدگی سے ذکر کیا گیا ہے:۔

"غیر جمہوری معاشروں نے اگرچہ بیشتر معاملات میں کسی اچھی کارکردگی کا ثبوت نہیں دیا، تاہم ہمیں خال خال مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں انہوں نے نسبتاً اچھے کام سرانجام دیئے ہیں۔ اُن کی کارکردگی خواہ اچھی تھی یا بُری، لیکن اُن کے اندر ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ آمریت چاہے کسی لباس میں جلوہ گر ہوئی ہو —— بادشاہت، مذہبی اجارہ داری، جاگیرداری، سرمایہ داری یا نوکرشاہی، ان میں سے ہر ایک نے عوام کو خوب لوٹا ہے۔ اور جب میں لوٹ کھسوٹ کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان تمام آمروں نے عوام کے حقوق کی حفاظت و پاسبانی کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کی ہے . . . . اس لیے اگر عوام اپنے مفادات کے تحفظ کے خواہشمند ہیں تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا نظام نافذ کریں جو نہ صرف اُن کی تمناؤں کا مظہر ہو بلکہ جسے وہ اپنے ہاتھوں سے خود چلا بھی سکیں۔ جو حکومت بھی عوام کے ہاتھوں سے نکل کر کسی دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو گی۔ وہ بالآخر اُس شخص یا طبقے کے مفادات کی حفاظت کے لیے وقف ہو کر رہ جائے گی۔"

یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ غلط طرزِ فکر اور طرزِ عمل جو آمریت کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی غور کریں کہ کیا یہ بیمار ذہنیت کبھی بھی اُس شخص یا گروہ کے اندر پرورش پا سکتی ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، جسے اس بات کا پورا یقین ہو کہ اُسے دنیا میں ہرگز غیر مسئول پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ آخرت کے دن اُسے اپنے ہر عمل کے بارے میں قادرِ مطلق کے سامنے اپنا حساب پیش کرنا ہو گا۔ پھر وہ شخص یا گروہ ان اعتقادات کو صرف خود ہی اپنانے پر اکتفا نہ کر رہا ہو

بلکہ پوری نسلِ انسانی کو اس امر کی دعوت دے رہا ہو کہ آؤ خدا کی غلامی کو قبول کر کے اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلائیں، دنیا کی تنگی دعُسر سے نکال کر اُن کو وسعت وکشائش ویُسر کی راہ دکھائیں اور ظلم وجور سے بچا کر عدل وانصاف کی فضا میں لائیں۔ بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اس لیے اُن کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے۔ اللہ کے نزدیک انسانوں کے درمیان شریف وکمین کی تقسیم کسی لحاظ سے بھی درست اور صحیح نہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ اُونچ نیچ شیطان کا بٹوارا ہے۔ تمام انسان ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔

مختصراً یہی ہے وہ دعوت جو جماعت اسلامی اور اس کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی برسوں سے پوری نوعِ بشری اور خاص طور پر مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔ اسی دعوت کی وضاحت میں انہوں نے ہر اُس نظریہ کا ابطال کیا ہے جو انسان کو اُس کے شرفِ انسانیت سے محروم کرے اور نوعِ بشری کے اندر اپنے مخصوص مفادات کی حفاظت کے لیے قلعے تعمیر کرے۔ ایسی جماعت کی قیادت انقلابی ہونے کے باوجود مزاج کے اعتبار سے کبھی آمرانہ نہیں ہو سکتی۔ جو قیادت اپنوں اور بیگانوں سے برملا یہ کہتی ہے کہ انسانیت کے اعتبار سے سارے انسان برابر ہیں وہ کس طرح آمریت کے سانچوں میں ڈھل سکتی ہے۔ محض کسی تحریک کا انقلابی ہونا اُس کے مزاج کو آمرانہ نہیں بنا دیتا۔ آمریت ایک روگ ہے جو غیر مسئول اقتدار کی ہوس سے انسان کو لگتا ہے۔ یہ ایک بیماری ہے جس کے جراثیم "انا ولا غیری" کے باطل احساس کے اندر پرورش پاتے ہیں۔

جماعت اسلامی کی قیادت کے مزاج کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر جمہوریت کی بنیادوں کی وضاحت کر دیں۔ حقیقی جمہوریت کا پہلا اصول یہ ہے کہ رنگ ونسل، زبان و وطن اور اسی قسم کے دوسرے مصنوعی اختلافات یکسر باطل ہیں اور ہر انسان واجب الاحترام ہے۔ انسانوں کے درمیان اگر کوئی حقیقی فرق ہے تو وہ فکر ونظر، سیرت وکردار، اخلاق واعمال اور ذہنی وعملی صلاحیتوں کے لحاظ سے ہے۔

دوسرے، ہر ذی شعور فردِ معاشرہ کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے اجتماعی معاملات میں پوری آزادی کے ساتھ شریک ہو سکے۔

تیسرے، قیادت میں محض رائے عام کے تقاضے سے کسی خون خرابے یا غیر معمولی دشواری کے بغیر تبدیلی لائی جا سکے۔

جمہوریت کے یہ تین مسلّمہ اصول ہیں جنہیں اس نظام کی روح کہا جا سکتا ہے۔ اب آپ انہیں اصولوں کی روشنی میں جماعت اسلامی کی قیادت کا جائزہ لیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جماعت ہر قسم کی طبقاتی، نسلی، وطنی تفریق سے بفضلِ ایزدی بالکل پاک ہے؟ کیا کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ اس امر کی نشان دہی کر سکتا ہے کہ اس کے اندر کسی فرد کو بھی اس کے رنگ، نسل، زبان، وطن، طبقے یا دولت و ثروت کی بنیاد پر کسی طرح کی کوئی برتری حاصل ہے؟ ان کے مابین جو فرق بھی ہے وہ صرف اُن کے کردار، دین کی سمجھ بوجھ، دنیا کے معاملات سے واقفیت، اللہ کے دین سے وابستگی، اور خدمتِ دین میں سرگرمی کی بنیاد پر ہے۔ یہاں ہر شخص کو اس امر کا پورا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنے بھائی کی نہ صرف اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا احتساب کرے بلکہ اُس کی ذاتی اور نجی زندگی کے متعلق بھی اگر اُسے کوئی چیز دین و اخلاق کے لحاظ سے قابلِ اعتراض محسوس ہو تو اس پر گرفت کرے۔ اس احتساب سے کوئی فرد بھی محفوظ نہیں، اور اس معاملے میں امیرِ جماعت سے لے کر عام کارکنوں تک سب سے ایک ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کام کو رفقاءِ جماعت جس جذبے، ولولے، بلکہ بسا اوقات جس غیر معمولی جوش و خروش سے انجام دے دیتے ہیں اس سے کبھی کبھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ احتساب کی صحیح حدود سے تجاوز کر رہے ہیں جس جماعت یا تحریک کے اندر تنقید و احتساب کی یہ آزادی ہو، اور سب شرکائے جماعت کے ساتھ، خواہ ان میں کسی کا مقام کتنا ہی بلند ہو، برابری کا سلوک کیا جائے۔ اس کی قیادت میں اگر آمرانہ رجحانات پرورش پانے لگیں تو یہ دنیا کے عجائبات میں سے

ایک عجوبہ ہو گا۔

اس ضمن میں یہ بھی دیکھیے کہ کیا کسی ایسی تحریک میں، جس کے اندر افراد اس واضح شعور و احساس کے ساتھ شامل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کا الٰہ، خالق، مالک، قانون ساز اور حقیقی فرمانروا ہے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم اُن کے مُطاع ہیں، آمریّت جڑ پکڑ سکتی ہے۔ آمریّت، جیسا کہ مَیں نے پہلے گزارش کی ہے، انسان کے اس غلط احساس پر مبنی ہے کہ وہ غیر مسئول ہے۔ لیکن جہاں لوگ ہر قدم پر اپنے بنائے ہوئے ضابطوں کے نہیں بلکہ اللہ کے قوانین کے پابند ہوں اور اسی پابندی کا عہد کر کے وہ جماعت میں شریک ہوئے ہوں، وہاں آمریّت کے اُبھرنے کے کیا امکانات ہوتے ہیں۔

جماعت کی قیادت کے مزاج کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا اس قیادت نے بعض ایسے مخصوص مفادات قائم کر رکھے ہیں جن سے آمریّت کے قیام میں مدد ملتی ہے؟ یہاں مرکزی امیرِ جماعت سے لے کر مقامی امراء تک پوری جماعت کے قائدین براہِ راست ارکان کی رائے سے منتخب کیے جاتے ہیں اور اس انتخاب میں کسی دباؤ یا لالچ سے کام لینے کا تو کیا سوال، کوئی شخص نہ خود امیدوار بن کر اٹھتا ہے، نہ اپنے لیے کوئی کنویسنگ کرتا ہے، بلکہ ارکانِ جماعت سے صرف یہ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں منصب کے لیے آپ کس شخص کو موزوں سمجھتے ہیں، اور اس طرح جس شخص کے حق میں بھی زیادہ رائیں آتی ہیں وہ منتخب ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ پر نیچے سے اُوپر تک تمام مجالسِ شوریٰ کے ارکان بھی عام ارکانِ جماعت کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں۔ امیرِ جماعتِ اسلامی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کے پابند ہیں اور وہ اپنی مجلسِ عاملہ کو بھی مجلسِ شوریٰ کے ارکان میں سے ہی منتخب کرتے ہیں حالانکہ دنیا کے جمہوری ادارات میں کہیں بھی پارٹی کے صدر پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنی مجلسِ عاملہ کے ارکان لازماً جنرل کونسل کے ممبروں ہی میں سے مقرر کرے۔ سوال یہ ہے کہ اس دستور کے تحت اس طرح کے نظام میں

آمریت کا اُبھرنا آخر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتے ہیں بعض کرم فرماؤں نے تحریر کے ذریعہ اور بعض نے زبانی گفتگوؤں میں یہ کہا ہے کہ جو حضرات جماعت کے بیت المال سے تنخواہ لیتے ہیں وہ آخر آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ جماعت اور خصوصاً اس کے ہمہ وقتی کارکنوں پر اس سے زیادہ اور کوئی سنگین الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ معاشرے کے ایسے ذلیل افراد ہیں جنہوں نے چند ٹکوں کی خاطر اپنے ضمیر اور ایمان کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھ میں رہن رکھ دیا ہے۔ ہمارے ناقدین تو ان حضرات کو صرف بے ضمیر انسانوں کا ٹولہ ہی کہتے ہیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ اگر انہوں نے واقعی چند سکوں کے لیے جماعت کے ہمہ وقتی کارکن بننا پسند کیا ہے تو وہ ضمیر سے عاری ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و فکر سے بھی یکسر عاری ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب محض مفادات نے انہیں تحریکِ اسلامی سے وابستہ کر رکھا ہے تو انہوں نے ایک ایسی جماعت کے ساتھ منسلک ہونا کیوں پسند کیا جہاں بالکل معمولی سے معاوضے کے سوا انہیں کوئی دوسری چیز حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاوضے کے بدلے میں آخر انہیں کیا ملا۔ جماعت اسلامی حکومت کی کوئی منظورِ نظر جماعت نہیں کہ اس کی رکنیت سے حکومت کے ایوانوں میں ان کی پذیرائی ہو اور انہیں یا ان کے اعزہ و اقارب کو پرمٹ، لائسنس، یا اونچے سرکاری مناصب ملنے میں آسانی ہو۔ جس شخص کو اپنا دنیاوی مفاد عزیز ہے وہ اگر اس کے حصول کے لیے سرکاری جماعت کو چھوڑ کر ایک ایسی جماعت کی طرف آتا ہے، جس میں اُس پر پابندیاں ہی پابندیاں ہیں، جس میں وہ ہر وقت اپنے رفقاء کی تنقید کا ہدف بنا رہتا ہے جس کی رکنیت اُسے حکومت کی نظروں میں معتوب بنا دیتی ہے اور وہ اس کی ساری نوازشات سے یکسر محروم ہو جاتا ہے، بلکہ قید و بند کی مصیبتیں بھی مول لینا ہے تو آخر ایسے شخص کے فاترالعقل ہونے میں کیا

شک کیا جاسکتا ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ ایسے ہی ضمیر فروش ہیں تو جماعت اِن کے ضمیر کی جو قیمت دیتی ہے اُس سے تو کچھ زیادہ ہی قیمت آج کل مارکیٹ میں مل رہی ہے۔ آخر ان لوگوں کو کسی اور نے کیوں نہ خرید لیا؟

باقی رہی معاوضوں کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ جماعت کے صحت مند نشو و نما کے لیے یہ نہایت ضروری اور مستحسن اقدام ہے۔ جن حضرات سے جماعت پورا وقت لیتی ہے اُن کی معاش کی ذمہ داری بہر حال اُسے ہی قبول کرنی چاہیے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنا پورا وقت تو جماعت کو دے دیں اور اپنی گذر اوقات کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کریں؟ اگر ہمیں انسانوں کی عزتِ نفس اور اُن کے وقار کی حفاظت کرنی ہے تو یہ اقدام ناگزیر ہے جن جماعتوں نے اپنے ہاں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں کیا اُن کے اندر جس قسم کی خیانتیں پیدا ہوئیں اُن کے بارے میں ہر وہ شخص جانتا ہے جو اُن سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اسی لیے اپنے اول روزِ تاسیس ہی سے یہ قاعدہ اختیار کیا تھا کہ اس تحریک کے کام کو چلانے کے لیے جن لوگوں کا سارا وقت لے لیا جائے اُن کی کفالت کا ذمہ جماعت کو لینا چاہیے، اور یہ بار اُن لوگوں کو مِل جُل کر اٹھانا چاہیے جو جماعت کو اپنا پورا وقت نہیں دیتے بلکہ اپنی معاش کے لیے کام کرتے ہوئے باقی ماندہ اوقات اِس تحریک کے کام میں صرف کرتے ہیں۔

پھر جو معاوضے ان بیچارے کارکنوں کو ملتے ہیں اور ان معاوضوں کے صلے میں انہیں جن صبر آزما حالات سے گزرنا پڑتا ہے اُن کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عملی طور پر ان سے دوچار رہیں۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے ہاں جن حضرات کو جو معاوضہ مل رہا ہے وہ اُن کی صلاحیت اور استعدادِ کار سے بہت ہی کم ہے اور اس کی حیثیت

کسی طرح بھی قوتِ لایموت سے زیادہ نہیں ہے جس سے وہ بیچارے بڑی مشکل سے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھتے ہیں۔ جماعت کے ان ہمہ وقتی کارکنوں میں ایک نہیں بلکہ کئی ایسے حضرات موجود ہیں جو اپنی علمی لیاقت، اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے فہم و تدبر اور اپنی قوتِ عمل سے معاشرے میں ہزاروں روپے کما سکتے ہیں لیکن وہ محض اللہ کے دین کی خاطر روکھی سوکھی کھا کر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا وقت گزار رہے ہیں۔ جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کوئی بیکار، نکمے اور بھک منگے نہیں جو سوسائٹی پر بار ہوں بلکہ وہ محنتی اور جفاکش لوگ ہیں اور یہاں انہیں جو کچھ ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ باہر کما سکتے ہیں۔ چنانچہ جن حضرات نے بھی جماعت کے کام کو چھوڑ کر دوسری جگہ وسائلِ رزق تلاش کیے ہیں انہیں اس مقصد میں گوناگوں کامیابی ہوئی ہے اور اُن میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو معاشی اعتبار سے بدحال ہو۔

یہ بات بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ ہمہ وقتی کارکن جن کا عزل و نصب ہر مقام اور علاقے کی جماعت میں خود اُسی مقام یا علاقے کے ارکانِ جماعت کی رائے سے ہوتا ہے، آخر مولانا مودودی کے غلام کیسے اور کیوں بن کر رہ گئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نہ ان کو مقرر کرتے ہیں، نہ ان کے معاوضے تجویز کرتے ہیں، نہ ان کی ترقی، تنزل یا علیحدگی میں ان کا کوئی دخل ہے، اور نہ ان کے معاوضے جماعت کے مرکزی خزانے سے دیئے جاتے ہیں کہ اسی اعتبار سے امیر جماعت کا ان پر کوئی دباؤ ہو۔ جماعت میں بجز مرکزی اسٹاف کے اور کوئی اسامی ایسی نہیں جس پر مولانا خود کسی کو مقرر کرتے ہوں۔ ہمہ وقتی کارکنوں کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے جو امراءِ شہر، امراءِ ضلع، اور امرائے حلقہ پر مشتمل ہے اور ان سارے حضرات کو ارکان منتخب کرتے ہیں۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان آخری مرحلہ پر محض اس کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے آج تک کوئی ایسی مثال نہیں آئی جس میں ارکان نے کسی شخص کو کثرتِ رائے سے منتخب کیا ہو اور مولانا مودودی نے محض اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی بنا پر اُس کے انتخاب کو رد کر دیا ہو۔ یہ

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

تفہیم القرآن

الزُّخْرُف

(۲)

کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا ؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اُس خدائے رحمان کی طرف منسوب کرتے ہیں اُس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے مُنہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔[۱۶]

۱۶؎ یہاں مشرکینِ عرب کی نامعقولیت کو پوری طرح بے نقاب کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کے بُت انہوں نے عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے، اور یہی اُن کی وہ دیویاں تھیں جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اوّل تو تم نے یہ جاننے اور ماننے کے باوجود کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، اور اِس زمین کو اُسی نے تمہارے لیے گہوارہ بنایا ہے، اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، اور اُسی نے یہ جانور تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں، اُس کے ساتھ دوسروں کو معبود بنایا۔ حالانکہ جنہیں تم معبود بنا رہے ہو وہ خدا نہیں بلکہ بندے ہیں۔ پھر مزید غضب یہ کیا کہ بعض بندوں کو صفات ہی میں نہیں بلکہ اللہ کی ذات میں بھی اُس کا شریک بنا ڈالا اور یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں۔ اس پر بھی تم نے بس نہ کیا اور اللہ کے لیے وہ اولاد تجویز کی جسے تم خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہو۔ بیٹی گھر میں پیدا ہو جائے تو تمہارا مُنہ کالا ہو جاتا ہے، خُون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہو، بلکہ بعض اوقات زندہ بچی کو دفن کر دیتے ہو۔ یہ اولاد تو آئی اللہ کے حصے میں، اور بیٹے، جو تمہارے نزدیک فخر کے قابل اولاد ہیں، مخصوص ہو گئے تمہارے لیے ؟ اس پر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے ماننے والے ہیں۔

کیا اللہ کے حصّے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی ؟[۱۸]

[۱۸] بالفاظِ دیگر جو نرم ونازک اور ضعیف وکمزور اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصّے میں ڈالی، اور خم ٹھونک کر میدان میں اُترنے والی اولاد خود لے اُڑے۔

اِس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔ یہی بات احادیث سے بھی ثابت ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور نسائی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک ہاتھ میں ریشم اور دوسرے ہاتھ میں سونا لے کر فرمایا یہ دونوں چیزیں لباس میں استعمال کرنا میری امت کے مردوں پر حرام ہے۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت نقل کی ہے کہ حضوؐر نے فرمایا کہ ریشم اور سونا میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں پر حرام کیا گیا۔ علامہ ابوبکر جصّاص نے احکام القرآن میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے حسبِ ذیل روایات نقل کی ہیں:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن حارثہ کے صاحبزادے اُسامہ بن زید کو چوٹ لگ گئی اور خون بہنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان سے اپنی اولاد جیسی محبت تھی۔ آپ ان کا خون چُوس چُوس کر تھوکتے جاتے اور ان کو یہ کہہ کہہ کر بہلاتے جاتے کہ اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے زیور پہناتے، اُسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا لبس الحریر والذھب حرام علیٰ ذکور امتی وحلال لاناثھا "ریشمی کپڑے اور سونے کے زیور پہننا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے"۔

حضرت عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تمہیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے ؟ انھوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو ان کا حق ادا کرو، یعنی ان کی زکوٰۃ نکالو۔

انہوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمان کے خاص بندے ہیں[۱۸]، عورتیں قرار دے لیا۔
کیا اُن کے جسم کی ساخت اِنہوں نے دیکھی ہے[۱۹]؟ اِن کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی۔
یہ کہتے ہیں اگر خدائے رحمٰن چاہتا (کہ ہم اُن کی عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی اُن کو نہ پُوجتے[۲۰]۔
یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے محض تیر تُکّے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اِس سے پہلے کوئی کتاب اِن کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ پیش کر سکتے ہوں[۲۱]؟ نہیں،

حضرت عائشہ کا قول ہے کہ زیور پہننے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔
حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ تمہاری عملداری میں جو مسلمان عورتیں رہتی ہیں اُن کو حکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ نکالیں۔
امام ابوحنیفہ نے عمرو بن دینار کے حوالہ سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عائشہ نے اپنی بہنوں کو اور حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بیٹیوں کو سونے کے زیور پہنائے تھے۔
ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ جصّاص لکھتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے جو روایات عورتوں کے لیے سونے اور ریشم کے حلال ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں وہ عدمِ جواز کی روایات سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں۔ اور آیت مذکورۂ بالا بھی اس کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ پھر امت کا عمل بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے سے ہمارے زمانے (یعنی چوتھی صدی کے آخری دَور) تک یہی رہا ہے، بغیر اس کے کہ کسی نے اس پر اعتراض کیا ہو۔ اِس طرح کے مسائل میں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی اعتراض تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

۱۸؎ یعنی مذکر یا مؤنث ہونے سے مبرا ہیں۔ یہ مفہوم فحوائے کلام سے خود بخود مترشح ہو رہا ہے۔

۱۹؎ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کیا اُن کی پیدائش کے وقت یہ موجود تھے؟"

۲۰؎ یہ اپنی گمراہی پر تقدیر سے اُن کا استدلال تھا جو ہمیشہ سے غلط کار لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا فرشتوں کی عبادت کرنا اسی لیے تو ممکن ہوا کہ اللہ نے ہمیں یہ کام کرنے دیا۔ اگر وہ نہ

بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔[۲۲] اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔[۲۳] ہر نبی نے ان سے پوچھا، کیا تم اُسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں اُس راستے

چاہتا کہ ہم یہ فعل کریں تو ہم کیسے کر سکتے تھے۔ پھر مدتہائے دراز سے ہمارے ہاں یہ کام ہو رہا ہے اور اللہ کی طرف سے اس پر کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو ہمارا یہ کام ناپسند نہیں ہے۔

[۲۱] مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ چونکہ اللہ کی مشیت کے تحت ہو رہا ہے، اس لیے ضرور اس کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے۔ حالانکہ اگر یہ استدلال صحیح ہو تو دنیا میں صرف ایک شرک ہی تو نہیں ہو رہا ہے۔ چوری، ڈاکہ، قتل، زنا، رشوت، بدعہدی، اور ایسے ہی دوسرے بے شمار جرائم بھی ہو رہے ہیں جنہیں کوئی شخص بھی نیکی اور بھلائی نہیں سمجھتا۔ پھر کیا اسی طرزِ استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جائے گا کہ یہ تمام افعال حلال و طیب ہیں، کیونکہ اللہ اپنی دنیا میں انہیں ہونے دے رہا ہے۔ اور جب وہ انہیں ہونے دے رہا ہے، تو ضرور وہ ان کو پسند بھی کرتا ہے؟ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ وہ واقعات نہیں ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں، بلکہ اللہ کی کتاب ہے جو اس کے رسول کے ذریعہ سے آتی ہے اور جس میں اللہ خود بتاتا ہے کہ اسے کونسے عقائد، کون سے اعمال، اور کون سے اخلاق پسند ہیں اور کون سے ناپسند۔ پس اگر قرآن سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب اِن لوگوں کے پاس ایسی موجود ہو جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ فرشتے بھی میرے ساتھ تمہارے معبود ہیں اور تم کو اُن کی عبادت بھی کرنی چاہیے، تو یہ لوگ اس کا حوالہ دیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۷۰-۵۷۳-۵۷۴-۵۸۷-۵۹۴ تا ۵۹۶۔ جلد دوم، ص ۲۰-۲۱۲-۳۷۳-۳۷۴-۴۶۱-۵۲۸-۵۲۹-۵۴۰-۵۶۸۔ جلد چہارم، الزمر، حاشیہ ۲۰۔ الشوریٰ، حاشیہ ۱۱۔)

[۲۲] یعنی ان کے پاس کسی کتابِ الٰہی کی کوئی سند نہیں ہے بلکہ سند صرف یہ ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آرہا ہے، لہٰذا ہم بھی انہی کی تقلید میں فرشتوں کو دیویاں بنائے بیٹھے ہیں۔

سے زیادہ صحیح راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ؟ انہوں نے سارے
رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں۔
آخر کار ہم نے اُن کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ع ۲
یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا[۲۷] کہ "تم جن کی بندگی
کرتے ہو میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اُس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری

---

۲۶ یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاء کے مقابلے میں اٹھ کر باپ دادا کی تقلید کا جھنڈا بلند کرنے والے ہر زمانے میں اپنی قوم کے کھاتے پیتے لوگ ہی کیوں رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہی حق کی مخالفت میں پیش پیش اور قائم شدہ جاہلیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہے، اور وہی عوام کو بہکا اور بھڑکا کر انبیاء علیہم السّلام کے خلاف فتنے اٹھاتے رہے۔ اس کے بنیادی وجوہ دو تھے۔ ایک یہ کہ کھاتے پیتے اور خوشحال طبقے اپنی دنیا بنانے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ حق اور باطل کی، بزعمِ خویش، دُور از کار بحث میں سر کھپانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُن کی تن آسانی اور ذہنی کاہلی انہیں دین کے معاملے میں انتہائی بے فکر، اور اس کے ساتھ عملاً قدامت پسند (CONSERVATIVE) بنا دیتی ہے تاکہ جو حالت پہلے سے قائم چلی آرہی ہے وہی، قطع نظر اس سے کہ وہ حق ہے یا باطل، جوں کی توں قائم رہے اور کسی نئے نظام کے متعلق سوچنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے یہ کہ قائم شدہ نظام سے اُن کے مفاد پوری طرح وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں، اور انبیاء علیہم السّلام کے پیش کردہ نظام کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں وہ بھانپ جاتے ہیں کہ یہ آئے گا تو ان کی چودھراہٹ کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے گی اور ان کے لیے اکلِ حرام اور فعلِ حرام کی بھی کوئی آزادی باقی نہ رہے گی۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۷۹۔ جلد دوم، ص ۴۰-۴۵-۴۹-۵۶-۶۶-۷۱-۳۳۳-۳۳۸-۶۰۶۔ جلد سوم، ص ۲۷۳-۲۷۴-۲۷۷-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۸۔ جلد چہارم، سبا آیت ۳۴، حاشیہ ۵۴)۔

۲۷ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، ص ۵۵۲ تا ۵۶۰۔ جلد دوم،

رہنمائی کرے گا[۲۵]۔ اور ابراہیم یہی کلمہ[۲۶] اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اِس کی طرف رجوع کریں[۲۷]۔ (اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو مَیں نے ان کو مٹا نہیں دیا،)

ص ۸۰۴ تا ۹۱۴ جلد سوم، ص ۶۹-۷۰، ۶۳۰ تا ۱۰۰۱-۶۹۴ تا ۵۰۵-۶۸۶ تا ۶۹۴ -جلد چہارم، آیات ۸۳ تا ۱۰۰ -حواشی ۴۴ تا ۵۵

[۲۵] ان الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے محض اپنا عقیدہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی دلیل بھی دے دی۔ دوسرے معبُودوں سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نہ انہوں نے پیدا کیا ہے، نہ وہ کسی معاملہ میں صحیح رہنمائی کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے تعلق جوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی انسان کی صحیح رہنمائی کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔

[۲۶] یعنی یہ بات کہ خالق کے سوا کوئی معبود ہونے کا مستحق نہیں ہے۔

[۲۷] یعنی جب بھی راہِ راست سے ذرا قدم ہٹے تو یہ کلمہ ان کی رہنمائی کے لیے موجود رہے اور وہ اسی کی طرف پلٹ آئیں۔ اِس واقعہ کو جس غرض کے لیے یہاں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش کی نامعقولیت کو پُوری طرح بے نقاب کر دیا جائے اور انہیں اس بات پر شرم دلائی جائے کہ تم نے اسلاف کی تقلید اختیار کی بھی تو اس کے لیے اپنے بہترین اسلاف کو چھوڑ کر اپنے بدترین اسلاف کا انتخاب کیا۔ عرب میں قریش کی مشیخت جس بنا پر چل رہی تھی وہ تو یہ تھی کہ وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل کی اولاد تھے اور ان کے بنائے ہوئے کعبے کی مجاوری کر رہے تھے۔ اس لیے انہیں پیروی اُن کی کرنی چاہیے تھی نہ کہ اپنے اُن جاہل اسلاف کی جنہوں نے حضرت ابراہیم و اسماعیل کے طریقے کو چھوڑ کر گرد و پیش کی بُت پرست قوموں سے شرک سیکھ لیا۔ پھر اس واقعہ کو بیان کر کے ایک اور پہلو سے بھی ان گمراہ لوگوں کی غلطی واضح کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حق و باطل کی تمیز کیے بغیر اگر آنکھیں بند کر کے باپ دادا کی تقلید کرنا درست ہوتا تو سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ یہ کام کرتے۔ مگر انہوں نے صاف صاف اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہہ دیا کہ مَیں تمہارے اِس جاہلانہ مذہب کی پیروی نہیں کر سکتا جس میں تم نے اپنے خالق کو چھوڑ کر اُن ہستیوں کو معبود بنا رکھا ہے جو خالق نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ حضرت ابراہیمؑ تقلیدِ آبائی

بلکہ مَیں انہیں اور اِن کے باپ دادا کو متاعِ حیات دیتا رہا یہاں تک کہ اِن کے پاس حق، اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا۔[۲۸] مگر جب وہ حق اِن کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے[۲۹] اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟[۳۰] کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اِن کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم

کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ باپ دادا کی پیروی کرنے سے پہلے آدمی کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے کہ وہ صحیح راستے پر بھی ہیں یا نہیں، اور اگر دلیلِ معقول سے یہ ظاہر ہو کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو اُن کی پیروی چھوڑ کر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو دلیل کی رُو سے حق ہو۔

۲۸؎ اصل میں رسولٌ مُّبِین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا رسول آگیا جس کا رسول ہونا بالکل ظاہر و باہر تھا جس کی نبوت سے پہلے کی زندگی اور بعد کی زندگی صاف شہادت دے رہی تھی کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔

۲۹؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم ص ۱۴۵-۱۴۶، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صٓ حاشیہ ۵

۳۰؎ دونوں شہروں سے مراد مکّہ اور طائف ہیں۔ کفّار کا کہنا یہ تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے اِن مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصّے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکّہ میں ولید بن مُغیرہ اور عُتبہ بن رَبیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعُود، حبیب بن عَمرو، کنانہ بن عبد عَمرو، اور ابن عبد یا لیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے درپے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے

نے اِن کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور اِن میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں [۱۱] اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت

سبے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشری رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اُتر آئے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے اور کھانے پینے سے مبرا نہ تھے (ملاحظہ ہو النحل، آیت ۴۳۔ بنی اسرائیل، ۹۴ - ۹۵۔ یوسف، ۱۰۹۔ الفرقان، ۷ - ۲۰۔ الانبیاء، ۷ - ۸۔ الرعد، ۳۸)۔ تو انہوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشری رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مالدار ہو۔ با اثر ہو۔ بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟

[۱۱] یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے جس کے اندر چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:۔

پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا اِن کا کام ہے کہ اللہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے)۔

دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں اُن کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بدآواز، کسی کو قوی ہیکل اور کسی کو کمزور، کسی کو ذہین اور کسی کو کند ذہن، کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا، کسی کو سلیم الاعضاء اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا بہرا، کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور اِن مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے اسے بدل دینا کسی کے

سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۳۲۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں، اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں، اور اُن کے دروازے، اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنوا دیتے۳۳۔ یہ تو محض حیاتِ دنیا کی متاع ہے، اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے ۳ع

بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا۔ اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آجاتا ہے اُسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اِس عالمگیر خدائی انتظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اِس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئیگا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسروں سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے اس کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حسن، طاقت، اقتدار، اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دیئے جائیں، اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

۳۲ یہاں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ خاص، یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو اُن کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اس

جو شخص رحمان کے ذکر[۳۴] سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا "کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تُو تو بدترین ساتھی نکلا۔" اُس وقت اِن لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں[۳۵]۔

اب کیا اے نبی، تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟[۳۶] اب تو ہمیں اِن کو سزا دینی ہے خواہ تمہیں دنیا سے اٹھا لیں، یا تم کو آنکھوں

دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ہی ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اِس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو۔

۳۳۔ یعنی یہ سیم و زر جس کا کسی کو مل جانا تمہاری نگاہ میں نعمت کی انتہا اور قدر و قیمت کی معراج ہے، اللہ کی نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام انسانوں کے کفر کی طرف ڈھلک پڑنے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ ہر کافر کا گھر سونے چاندی کا بنا دیتا۔ اس جنسِ فرومایہ کی فراوانی آخر کب سے انسان کی شرافت اور پاکیزگیٔ نفس اور طہارتِ رُوح کی دلیل بن گئی؟ یہ مال تو اُن خبیث ترین انسانوں کے پاس بھی پایا جاتا ہے جن کے گھناؤنے کردار کی سڑاند سے سارا معاشرہ متعفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِسے تم نے آدمی کی بڑائی کا معیار بنا رکھا ہے؟

۳۴۔ وسیع المعنی لفظ ہے۔ رحمان کے ذکر سے مُراد اس کی یاد بھی ہے، اُس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی، اور یہ قرآن بھی۔

۳۵۔ یعنی اِس امر میں تمہارے لیے تسلی کا کوئی پہلو نہیں ہے کہ تمہیں غلط راہ پر ڈالنے والے کو

سے اِن کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے اِن سے وعدہ کیا ہے، ہمیں اِن پر پُوری قدرت حاصل ہے[۳۸]۔ تم بہر حال اُس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو[۳۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدہی کرنی ہوگی[۳۹]۔

سزا مل رہی ہے. کیونکہ وہی سزا گمراہی قبول کرنے کی پاداش میں تم بھی پا رہے ہو۔

[۳۶] مطلب یہ ہے کہ جو سننے کے لیے تیار ہوں اور جنہوں نے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں. اُن کی طرف توجہ کرو، اور اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی کوشش میں اپنی جان نہ کھپاؤ، نہ اِس غم میں اپنے آپ کو گھلاتے رہو کہ تمہارے یہ بھائی بند کیوں راہ راست پر نہیں آتے اور کیوں اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

[۳۷] اِس ارشاد کا مطلب اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے ہی اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی ہے. کفارِ مکہ یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی اُن کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے، یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے تو پھر سب اچھا ہو جائے گا۔ اِسی گمانِ فاسد کی بنا پر وہ شب و روز بیٹھ بیٹھ کر مشورے کرتے تھے کہ آپ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ اُن کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہارے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم زندہ رہو گے تو تمہاری آنکھوں کے سامنے اِن کی شامت آئے گی، اُٹھا لیے جاؤ گے تو تمہارے پیچھے اِن کی خبر لی جائے گی۔ شامتِ اعمال اب اِن کی دامن گیر ہو چکی ہے جس سے یہ بچ نہیں سکتے۔

[۳۸] یعنی تم اِس فکر میں نہ پڑو کہ ظلم اور بے ایمانی کے ساتھ حق کی مخالفت کرنے والے اپنے کیے کی کیا اور کب سزا پاتے ہیں، نہ اِس بات کی فکر کرو کہ اسلام کو تمہاری زندگی میں فروغ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ تمہارے لیے بس یہ اطمینان کافی ہے کہ تم حق پر ہو۔ لہٰذا نتائج کی فکر کیے بغیر اپنا فرض انجام دیتے چلے جاؤ اور یہ اللہ پر چھوڑ دو کہ وہ باطل کا سر تمہارے سامنے نیچا کرتا ہے یا تمہارے پیچھے۔

تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے اُن سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے
سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ اُن کی بندگی کی جائے؟[۴۰] ع۴

[۴۱] ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ[۴۲] فرعون اور اُس کے اعیانِ سلطنت کے پاس

---

۳۹ یعنی اِس سے بڑھ کر کسی شخص کی کوئی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ تمام انسانوں میں سے اُس کو اللہ اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے منتخب کرے، اور کسی قوم کے حق میں بھی اس سے بڑی کسی خوش قسمتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی دوسری سب قوموں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اُس کے ہاں اپنا نبی پیدا کرے اور اُس کی زبان میں اپنی کتاب نازل کرے اور اسے دنیا میں پیغامِ خداوندی کی حامل بن کر اُٹھنے کا موقع دے۔ اِس شرفِ عظیم کا احساس اگر قریش اور اہلِ عرب کو نہیں ہے اور وہ اس کی ناقدری کرنا چاہتے ہیں تو ایک وقت آئے گا جب انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۴۰ رسولوں سے پوچھنے کا مطلب اُن کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے جس طرح فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرو، اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات سکھائی تھی کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے؟

۴۱ یہ قصہ یہاں تین مقاصد کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ملک اور کسی قوم میں اپنا نبی بھیج کر اسے وہ موقع عطا فرماتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اب اہلِ عرب کو اُس نے عطا فرمایا ہے، اور وہ اُس کی قدر کرنے اور اُس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس حماقت کا ارتکاب کرتی ہے جس کا ارتکاب فرعون اور اس کی قوم نے کیا تھا تو پھر اس کا وہ انجام ہوتا ہے جو تاریخ میں نمونۂ عبرت بن چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ فرعون نے بھی اپنی بادشاہی اور اپنی

بھیجا، اور اس نے جا کر کہا کہ مَیں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اُس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی اُن کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی، اور ہم نے اُن کو عذاب میں دھر لیا تاکہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔[۴۳] ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے "اے ساحر، اپنے رب کی طرف سے جو منصب

شوکت و حشمت اور دولت و ثروت پر فخر کر کے موسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح حقیر سمجھا تھا جس طرح اب کفارِ قریش اپنے سرداروں کے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ مگر خدا کا فیصلہ کچھ اور تھا جس نے آخر بتا دیا کہ اصل میں حقیر و ذلیل کون تھا۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق اور اس کی تنبیہات کے مقابلے میں ہیکڑی دکھانا کوئی سستا سودا نہیں ہے بلکہ یہ سودا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس کا خمیازہ جو بھگت چکے ہیں اُن کی مثال سے سبق نہ لوگے تو خود بھی ایک روز وہی خمیازہ بھگت کر رہو گے۔

[۴۲] اِن سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں ہیں جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں گئے تھے، یعنی عصا اور یدِ بیضا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۵ تا ۶۸۔ جلد سوم، ص ۹۱ - ۱۰۰ - ۴۸۷ تا ۴۹۰ - ۵۵۹ - ۵۶۰ - ۶۲۳)

[۴۳] اِن نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے اُن کو دکھائیں، اور وہ یہ تھیں:

(۱) جادوگروں سے اللہ کے نبی کا برسرِ عام مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر ایمان لے آئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۷ تا ۷۰۔ جلد سوم، ص ۱۰۰ تا ۱۰۷ - ۴۸۹ تا ۴۹۴۔

(۲) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق مصر کی سرزمین میں شدید قحط برپا ہو گیا اور وہ ان کی دعا پر ہی دُور ہوا۔

(۳) اُن کے پیشگی اعلان کے بعد سارے ملک میں ہولناک بارشوں اور ژالہ باری اور گرج اور کڑک کے طوفان آئے جنہوں نے بستیوں اور کھیتیوں کو تباہ کر ڈالا، اور یہ بلا بھی اُن کی دُعا سے ہی دفع ہوئی۔

(۴) پُورے ملک پر ان کے اعلان کے مطابق ٹڈی دلوں کا خوفناک حملہ ہُوا اور یہ آفت بھی اس وقت تک نہ ٹلی جب تک انہوں نے اسے ٹالنے کے لیے اللہ سے دُعا نہ کی۔

(۵) ملک بھر میں ان کے اعلان کے مطابق جوئیں اور سُرسُریاں پھیل گئیں جن سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت مبتلائے عذاب ہوئے اور دوسری طرف غلّوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ یہ عذاب بھی اُس وقت ٹلا جب حضرت موسیٰ سے درخواست کر کے دُعا کرائی گئی۔

(۶) ملک کے گوشے گوشے میں اُن کی قبل از وقت تنبیہ کے مطابق مینڈکوں کا سیلاب اُمنڈ آیا جس نے پُوری آبادی کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ اللہ کی یہ فوج بھی حضرت موسیٰ کی دعا کے بغیر واپس نہ گئی۔

(۷) ٹھیک اُن کے اعلان کے مطابق خُون کا عذاب رُونما ہُوا جس سے تمام نہروں، کنوؤں، چشموں، تالابوں اور حوضوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی کے ذخیروں میں تعفن پیدا ہو گیا، اور پُورے ایک ہفتے تک مصر کے لوگ صاف پانی کو ترس گئے۔ یہ آفت بھی اُس وقت ٹلی جب اس سے نجات پانے کے لیے حضرت موسیٰ سے دُعا کرائی گئی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۷۲-۷۳، جلد سوم، ص ۵۶۰-۵۶۱۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳۷۔

بائبل کی کتاب خروج، باب ۷-۸-۹-۱۰ اور ۱۲ میں بھی اِن عذابوں کی مفصل رُوداد درج ہے، مگر وہ گپ اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ اُس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ویسا ہی لاکر دکھا دیا۔ مگر جب جُوؤں کا عذاب آیا تو جادُوگر جواب میں جوئیں پیدا نہ کر سکے اور انہوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا سیلاب اُٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے، لیکن اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دُعا کر کے اس عذاب کو دفع کرائیے۔ سوال یہ ہے کہ جب جادُوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر تھے تو فرعون نے انہی کے ذریعہ سے یہ عذاب کیوں نہ دُور کرا لیا؟ اور آخر یہ معلوم کیسے ہُوا کہ مینڈکوں کی اِس فوج میں اللہ کے مینڈک کونسے ہیں اور جادُوگروں کے مینڈک کون سے؟ یہی سوال خون کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون

تجھے حاصل ہے اُس کی بنا پر ہمارے لیے اُس سے دعا کر، ہم ضرور راہِ راست پر آجائیں گے، مگر جُوں ہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔[۱۲۲] ایک روز

میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادُوگروں نے کس پانی کو خون بنایا اور کیسے معلوم ہوا کہ فلاں جگہ کا پانی جادوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے؟ ایسی ہی باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بائیبل خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اُس کو جن لوگوں نے تصنیف کیا ہے انہوں نے اس کے اندر اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا دیا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ یہ مصنّفین کچھ تھے بھی واجبی سی عقل کے لوگ جنہیں بات گھڑنے کا سلیقہ بھی نصیب نہ تھا۔

۱۲۲ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی ہٹ دھرمی کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ خدا کے عذاب سے تنگ آکر حضرت موسیٰ سے اُس کے ٹلنے کی دُعا کرانا چاہتے تھے اُس وقت بھی وہ آپ کو پیغمبر کہنے کے بجائے جادُوگر ہی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ جادُو کی حقیقت سے ناواقف نہ تھے، اور ان سے یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی کہ یہ کرشمے کسی جادُو سے رُونما نہیں ہو سکتے۔ ایک جادُوگر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدُود رقبے میں جو لوگ اُس کے سامنے موجود ہوں اُن کے ذہن پر ایسا اثر ڈالے جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ پانی خون بن گیا ہے، یا مینڈک اُبلے پڑ رہے ہیں، یا ٹڈی دل چڑھے چلے آرہے ہیں۔ اور اس محدُود رقبے کے اندر بھی کوئی پانی حقیقت میں خون نہ بن جائیگا بلکہ اس دائرے سے نکلتے ہی پانی کا پانی رہ جائے گا۔ کوئی مینڈک فی الواقع پیدا نہ ہوگا بلکہ اسے پکڑ کر آپ اس دائرے سے باہر لے جائیں گے تو آپ کے ہاتھ میں مینڈک کے بجائے صرف ہوا ہو گی۔ ٹڈی دل بھی محض خیالی دَل ہوگا، کسی کھیت کو وہ نہ چاٹ سکے گا۔ رہی یہ بات کہ ایک پُورے ملک میں قحط برپا ہو جائے، یا تمام ملک کی نہریں اور چشمے اور کنوئیں خون سے بھر جائیں، یا ہزارہا مربّع میل کے رقبے پر ٹڈی دل ٹوٹ پڑیں اور وہ لاکھوں ایکڑ کے کھیت صاف کر جائیں، یہ کام نہ آج تک کبھی کوئی جادوگر کر سکا ہے، نہ جادُو کے زور سے کبھی یہ ہو سکتا ہے۔ ایسے جادُوگر کسی بادشاہ کے پاس ہوتے تو اسے فوج رکھنے اور جنگ کی مصیبتیں جھیلنے کی کیا ضرورت تھی، جادُو کے زور سے وہ ساری دنیا کو مسخر کر سکتا

تھا۔ بلکہ جادوگروں کے پاس یہ طاقت ہوتی تو وہ بادشاہوں کی ملازمت کیوں کرتے؟ خود بادشاہ نہ بن بیٹھتے؟

مفسرین کو بالعموم یہ پریشانی پیش آتی ہے کہ جب عذاب سے نجات پانے کے لیے فرعون اور اس کے درباری حضرت موسیٰ سے دعا کی درخواست کرتے تھے اُس وقت وہ ان کو "اے ساحر" کہہ کر کیسے خطاب کرتے تھے مصیبت کے وقت مدد کی التجا کرنے والا تو خوشامد کرتا ہے نہ کہ مذمت۔ اسی وجہ سے انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ جادو اس زمانے کے اہلِ مصر کے نزدیک بڑا باوقعت علم تھا اور "اے ساحر" کہہ کر دراصل وہ حضرت موسیٰ کی مذمت نہ کرتے تھے بلکہ اپنے نزدیک عزت کے ساتھ وہ گویا ان کو "اے عالم" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن یہ تاویل اس بنا پر بالکل غلط ہے کہ قرآن میں دوسرے مقامات پر جہاں جہاں بھی فرعون کے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں جن میں اس نے حضرت موسیٰ کو جادوگر اور ان کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہا ہے، وہاں مذمت اور تحقیر کا انداز صاف ظاہر ہوتا ہے، اور صریحاً یہ نظر آتا ہے کہ اس کے نزدیک جادو ایک جھوٹی چیز تھی جس کا الزام حضرت موسیٰ پر رکھ کر وہ آپ کو جھوٹا مدعیِ نبوت قرار دیتا تھا۔ اس لیے یہ ماننے کے قابل بات نہیں ہے کہ یکایک اِس مقام پر اُس کی نگاہ میں "ساحر" ایک باعزت عالم کا لقب بن گیا ہو۔ رہا یہ سوال کہ جب دُعا کی درخواست کرتے وقت بھی وہ علانیہ حضرت موسیٰ کی توہین کرتا تھا تو آپ اُس کی درخواست کو قبول ہی کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنجناب کے پیشِ نظر اللہ کے حکم سے اُن لوگوں پر حجت تمام کرنا تھا۔ عذاب ٹالنے کے لیے اُن کا آپ سے دُعا کی درخواست کرنا خود یہ ثابت کر رہا تھا کہ اپنے دلوں میں وہ جان چکے ہیں کہ یہ عذاب کیوں آ رہے ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں، اور کون انہیں ٹال سکتا ہے۔ اس کے باوجود جب وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور عذاب ٹل جانے کے بعد راہ راست قبول کرنے کے وعدے سے پھر جاتے تھے، تو درحقیقت وہ اللہ کے نبی کا کچھ نہ بگاڑتے تھے بلکہ اپنے خلاف اُس مقدمے کو اور زیادہ مضبوط کرتے چلے جاتے تھے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے کلی استیصال کی شکل میں آخر کر دیا۔ اُن کا آپ کو ساحر کہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ درحقیقت اپنے دل میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ عذاب ان پر جادو کے زور سے آ رہے ہیں۔ بلکہ اپنے دلوں میں وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ اللہ رب العالمین کی نشانیاں ہیں، اور پھر جان بوجھ کر اُن کا انکار

فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا،[۴۵] " لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟[۴۶] مَیں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے[۴۷] اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟[۴۸] کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اُتارے گئے؟

کرتے تھے یہی بات ہے جو سورۂ نمل میں فرمائی گئی ہے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (آیت ۱۴)، "ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انہوں نے ظلم کیا اور تکبّر کی بنا پر ان نشانیوں کا انکار کیا"۔

۴۵ غالباً پُوری قوم میں پکارنے کی عملی صورت یہ رہی ہو گی کہ فرعون نے جو بات اپنے دربار میں سلطنت کے اعیان و اکابر اور قوم کے بڑے بڑے سرداروں کو مخاطب کر کے کہی تھی، اُسی کو منادیوں کے ذریعہ سے پُورے ملک کے شہروں اور قریوں میں نشر کرایا گیا ہو گا۔ بے چارے کے پاس اُس زمانہ میں یہ ذرائع نہ تھے کہ خوشامدی پریس، خانہ ساز خبر رساں ایجنسیوں، اور سرکاری ریڈیو سے منادی کراتا۔

۴۶ منادی کا یہ مضمون ہی صاف بتا رہا ہے کہ ہز میجسٹی کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ حضرت موسیٰ کے پے درپے معجزات نے ملک کے عوام کا عقیدہ اپنے دیوتاؤں پر سے متزلزل کر دیا تھا اور فراعنہ کا باندھا ہوا وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا جس کے ذریعہ سے خداؤں کا اوتار بن کر یہ خاندان مصر میں اپنی خداوندی چلا رہا تھا۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر فرعون چیخ اٹھا کہ کم بختو، تمہیں آنکھوں سے نظر نہیں آتا کہ اِس ملک میں بادشاہی کس کی ہے اور دریائے نیل سے نکلی ہوئی یہ نہریں، جن پر تمہاری ساری معیشت کا انحصار ہے، کس کے حکم سے جاری ہیں؟ یہ ترقیات (DEVELOPMENTS) کے کام تو میرے اور میرے خاندان کے کیے ہوئے ہیں، اور تم گرویدہ ہو رہے ہو اس فقیر کے۔

۴۷ یعنی جس کے پاس نہ مال و دولت ہے نہ اختیار و اقتدار۔ وہی اعتراض جو کفّارِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا۔

۴۸ بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ فرعون کا اعتراض اُس لکنت پر تھا جو حضرت موسیٰ کی زبان میں بچپن سے تھی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب نبوّت

یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟[۴۹]

اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ[۵۰]۔ آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو

کے منصب پر سرفراز کیا جا رہا تھا اُس وقت انہوں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ میری زبان کی گرہ کھول دیجیے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں اور اُسی وقت ان کی دوسری درخواستوں کے ساتھ یہ درخواست بھی قبول کر لی گئی تھی (آیات ۲۷ تا ۳۶)، پھر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر حضرت موسیٰ کی جو تقریریں نقل کی گئی ہیں وہ کمال درجے کی طلاقتِ لسانی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا فرعون کے اعتراض کی بنا کوئی لکنت نہ تھی جو آنحضرت کی زبان میں ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص نہ معلوم کیا اُلجھی اُلجھی باتیں کرتا ہے، ما بدولت کی سمجھ میں تو کبھی اس کا مدّعا آیا نہیں۔

۴۹ؔ قدیم زمانے میں جب کسی شخص کو کسی علاقے کی گورنری، یا کسی غیر ملک کی سفارت کے منصب پر مقرر کیا جاتا تو بادشاہ کی طرف سے اس کو خلعت عطا ہوتا تھا جس میں سونے کے کڑے یا کنگن بھی شامل ہوتے تھے۔ اور اُس کے ساتھ سپاہیوں، چوبداروں اور خدّام کا ایک دستہ بھی ہوتا تھا تاکہ اس کا رُعب اور دبدبہ قائم ہو اور اُس بادشاہ کی شان و شوکت کا اظہار ہو جس کی طرف سے وہ مامور ہو کر آ رہا ہے۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی موسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان کے بادشاہ نے اپنی جانب کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا تو اسے خلعتِ شاہی ملا ہوتا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اس کے ساتھ آئے ہوتے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ملنگ ہاتھ میں لاٹھی لیے آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں!

۵۰ؔ اس مختصر سے فقرے میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مطلق العنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے کھلّم کھلا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بکتے نہیں انہیں بے دریغ کچلتا اور روندتا ہے، تو خواہ زبان سے وہ یہ بات نہ کہے مگر اپنے

اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونۂ عبرت بنا کر رکھ دیا۔ [۵۶] ع

عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اس ملک کے باشندوں کو عقل اور اخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے۔ اور اُس نے اُن کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں ان بے وقوف، بے ضمیر اور بُزدل لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اس کی یہ تدبیریں کامیاب ہو جاتی ہیں اور ملک کے باشندے اس کے دست بستہ غلام بن جاتے ہیں تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اُس خبیث نے جو کچھ اُنہیں سمجھا تھا، واقعی وہ وہی کچھ ہیں۔ اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ اِن مسائل کے بجائے اُن کے لیے اصل اہمیت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبّار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قبول کرنے، اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

[۵۶] یعنی جو اُن کے انجام سے سبق نہ لیں اور اُنہی کی روش پر چلیں اُن کے لیے وہ پیش رو ہیں، اور جو سبق لینے والے ہیں اُن کے لیے نمونۂ عبرت۔

ضروری اعلان

ترجمان القرآن کے منصب رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر میں موجود ہیں۔ قیمت فی کاپی ۳/۵۰ روپے ہے۔ مگر اب فی کاپی صرف ۲ روپے مع محصول ڈاک ہے۔ خواہشمند حضرات فوراً توجہ دیں۔

مینجر ترجمان القرآن لاہور

خلافتِ راشدہ اور اُس کی خصوصیات

ابوالاعلیٰ مودودی

اس سے پہلے اِن صفحات میں اسلام کے جو اصولِ حکمرانی بیان کیے جا چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت انہی اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ کی براہِ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی رُوح کے مطابق کس قسم کا نظامِ حکومت بننا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوریٰ خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ، یا برائے نام بھی کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امّت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اِس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

انتخابی خلافت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اُس وقت پُورے مُلک میں عملاً نمائندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کے حق میں وصیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے کہا:

"کیا تم اُس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں؟ خدا کی قسم مَیں نے

راستے قائم کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمر بن الخطاب کو جانشین مقرر کیا ہے، لہٰذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔"

اس پر لوگوں نے کہا "ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔"[۳۰]

حضرت عمرؓ کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ "اگر عمرؓ کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا، کیونکہ ابوبکرؓ کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی اور آخر وہ کامیاب ہو گئی۔"[۳۱] حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور "عوام کو اُن لوگوں سے خبردار کروں گا جو اُن کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں۔" چنانچہ مدینے پہنچ کر انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصّے کا ذکر کیا اور بڑی تفصیل کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ کی سرگزشت بیان کر کے یہ بتایا کہ اُس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابوبکرؓ کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرمایا: اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کیے بغیر ہم لوگ مجلس سے اُٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لیے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لیے نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ تم میں ابوبکر جیسی بلند و بالا اور مقبول شخصیت کا آدمی اور کون ہے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی، دونوں اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں گے۔"[۳۲]

---

۳۰ الطّبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۲، ص ۶۱۸، المطبعۃ الاستقامہ، قاہرہ ۱۹۳۹ء

۳۱ اُس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اُٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔

۳۲ بخاری، کتاب المحاربین، باب ۱۶۔ مسند احمد، ج ۱، حدیث نمبر ۳۹۱، طبع ثالث، دارالمعارف مصر، ۱۹۴۹ء۔ مسند احمد

اپنے تشریح کردہ اسی قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک انتخابی مجلس مقرر کی اور فرمایا "جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بننے کی کوشش کرے اسے قتل کر دو۔" اس کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹے کو خلافت کے استحقاق سے صاف الفاظ میں مستثنیٰ کر دیا تاکہ خلافت ایک موروثی منصب نہ بن جائے۔[۴] یہ انتخابی مجلس اُن چھ اشخاص پر مشتمل تھی جو حضرت عمرؓ کے نزدیک قوم میں سب سے زیادہ بااثر اور مقبول عام تھے۔

اس مجلس نے آخر کار اپنے ایک رکن، عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار دے دیا۔ انہوں نے عام لوگوں میں چل پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ تر کس شخص کی طرف ہے۔ حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا۔ اور اس استصواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمانؓ کے حق میں ہیں۔[۵] اسی بنیاد پر حضرت عثمانؓ خلافت کے لیے منتخب کیے گئے اور مجمع عام میں ان کی بیعت ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے کہا "تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے

کی اس روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی۔" ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ "جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لیے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے۔" (ابنِ حَجَر، فتح الباری، ج ۲، ص ۱۲۵، المطبعۃ الخیریہ، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ)

[۴] الطّبری، ج ۳، ص ۲۹۲۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۴، ۳۵، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۵۶ھ۔

[۵] حوالۂ مذکور، نیز ابنِ قُتَیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۳، مطبعۃ الفتوح، مصر، ۱۳۳۱ھ۔

پر غور کریں گے[۶]"۔ طبری کی روایت میں حضرت علیؓ کے الفاظ یہ ہیں: "میری بیعت خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہونی چاہیئے[۷]"۔

حضرت علیؓ کی وفات کے وقت لوگوں نے پوچھا کہ ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے جواب میں کہا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو[۸]"۔ ایک شخص نے عین اُس وقت جبکہ آپ اپنے صاحبزادوں کو آخری وصیت کر رہے تھے، عرض کیا کہ امیر المومنین آپ اپنا ولی عہد کیوں نہیں مقرر کر دیتے۔ جواب میں فرمایا "میں مسلمانوں کو اُسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا[۹]"۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔ موروثی، یا طاقت سے برسرِ اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں صحیح نہ تھی۔

شوروی حکومت یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کیئے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ سُنن الدارمی میں حضرت میمون بن مہران کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملہ میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملہ میں کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ اور اگر سنتِ رسول میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے سرکردہ اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے، پھر جو رائے

---

[۶] ابن قتیبہ، ج ۱، ص ۴۱

[۷] الطبری، ج ۳، ص ۴۵۰

[۸] الطبری، ج ۴، ص ۱۱۲۔ المسعودی، مُرُوجُ الذَّھَب۔ ج ۲، ص ۴۲، المطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۶ھ

[۹] المسعودی، ج ۲ ص ۴۲۔

بھی سب کے مشورے سے قرار پائی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے[10]۔ یہی طرزِ عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا[11]۔

مشورے کے معاملے میں خلفائے راشدین کا تصور یہ تھا کہ اہلِ شوریٰ کو پوری آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کرنے کا حق ہے۔ اس معاملے میں خلافت کی پالیسی کو حضرت عمرؓ نے ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں یوں بیان فرمایا ہے:

"میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی لوگ وہ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں[12]۔"

بیت المال کے امانت ہونے کا تصور بیت المال کو وہ خدا اور خلق (PUBLIC) کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے اور اس میں سے کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے۔ فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لیے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ جس روز خلیفہ ہوئے اس کے دوسرے دن کندھے پر کپڑے کے تھان رکھ کر بیچنے کے لیے نکلے (خلافت سے پہلے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا)۔ راستے میں حضرت عمرؓ ملے اور انہوں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جواب دیا، اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ انہوں نے کہا، اب آپ کے اوپر مسلمانوں کی سربراہ کاری کا بار آ پڑا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ نہیں نبھ سکتا۔ چلیے، ابو عبیدہ (ناظم بیت المال) سے مل کر بات کرتے

---

[10] سنن الدارمی، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ

[11] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۲۸۱

[12] امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۵۔

ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ سے گفتگو کی گئی۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لیے مہاجرین میں سے ایک عام آدمی کی آمدنی کا معیار سامنے رکھ کر ایک وظیفہ مقرر کیے دیتے ہیں جو نہ ان کے سب سے زیادہ دولتمند کے برابر ہوگا نہ سب سے غریب کے برابر۔ اس طرح ان کے لیے ایک وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو تقریباً ۴ ہزار درہم سالانہ تھا۔ مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے ۸ ہزار درہم بیت المال کو واپس کر دیے جائیں۔ یہ مال جب حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انہوں نے کہا، خدا ابوبکر پر رحمت فرمائے، اپنے بعد آنے والوں کو انہوں نے مشکل میں ڈال دیا۔[۱۳]

حضرت عمرؓ اپنی ایک تقریر میں بیان کرتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا کیا حق ہے:

"میرے لیے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لیے اور ایک جاڑے کے لیے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لیے لے لوں۔ پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے۔[۱۴]"

ایک اور تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

"میں اس مال کے معاملہ میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ لیا جائے۔ حق کے مطابق دیا جائے۔ اور باطل سے اس کو روکا جائے۔ میرا تعلق تمہارے اس مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔[۱۵]"

حضرت علی کا جس زمانے میں حضرت معاویہؓ سے مقابلہ درپیش تھا، لوگوں نے ان کو مشورہ

---

[۱۳] کنز العمال۔ ج ۵، ح ۲۲۸۰ - ۲۲۸۵

[۱۴] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۳۴، مطبعۃ السعادہ، مصر

[۱۵] ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۷۔

دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کر اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بہا کر اپنے حامی پیدا کریں۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ "کیا تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں"[۱۱]۔ ان سے خود ان کے بھائی حضرت عقیلؓ نے چاہا کہ وہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے؟[۱۲]

حکومت کا تصور ان لوگوں کا تصورِ حکومت کیا تھا، فرمانروا ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مقام اور اپنے فرائض کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ اور اپنی حکومت میں کس پالیسی پر عامل تھے، ان چیزوں کو انہوں نے خود خلافت کے منبر سے تقریریں کرتے ہوئے برسرِ عام بیان کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی پہلی تقریر جو انہوں نے مسجدِ نبوی میں عام بیعت کے بعد کی، اس میں وہ کہتے ہیں:

> "میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے۔ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کے بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لیے دُعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو اسے بادلِ ناخواستہ اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھائے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحابِ رسول اللہ میں سے کسی اور کو اس کام کے لیے چُن لیں، میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔ آپ لوگ

---

[۱۱] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۱۸۲، دار الکتب العربیہ، مصر، ۱۳۲۹ھ

[۱۲] ابنِ قتیبہ، الامامہ والسیاسہ، ج ۱، ص ۷۱۔

اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضور سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے، اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے، اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں[۱۸]۔

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

"لوگو، کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے ... لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کیے دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج یا اللہ کے عطا کردہ فے میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق، اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق[۱۹]۔"

---

[۱۸] الطبری، ج ۲، ص ۴۵۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۴ ص ۳۱۱ مطبعۃ مصطفی البابی، مصر ۱۹۳۶ء۔ کنز العمال، ج ۵، احادیث نمبر ۲۲۶۱-۲۲۶۴-۲۲۶۸-۲۲۷۸-۲۲۹۱-۲۲۹۹۔

[۱۹] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۷۔

حضرت ابوبکر جب شام و فلسطین کی مہم پر حضرت عمرو بن العاص کو روانہ کر رہے تھے، اس وقت انہوں نے جو ہدایات ان کو دیں ان میں وہ فرماتے ہیں:

"اے عمرو، اپنے کھلے اور چھپے ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو اور اس سے حیا کرو، کیونکہ وہ تمہیں اور تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آخرت کے لیے کام کرو اور اپنے ہر عمل میں خدا کی رضا کو پیش نظر رکھو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹٹولو اور ان کے ظاہر پر ہی ان سے معاملہ کرو ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے آپ کو درست رکھو، تمہاری رعیت بھی درست رہے گی"[۶۰]

حضرت عمرؓ جن لوگوں کو عامل بنا کر کہیں بھیجتے تھے ان کو خطاب کر کے کہتے:

"میں تم لوگوں کو امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ بلکہ میں اس لیے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو، لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو"[۶۱]

ایک مرتبہ انہوں نے برسرِ عام اعلان کیا کہ "میں نے اپنے عاملوں کو اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تم لوگوں کو پیٹیں اور تمہارے مال چھینیں، بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس شکایت لائے، خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا" اس پر حضرت عمروؓ بن العاص (مصر کے گورنر) نے اٹھ کر کہا "اگر کوئی شخص مسلمانوں کا والی ہو اور تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں، خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے"[۶۲]

۶۰۔ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۱۳ ۶۱۔ الطبری، ج ۳، ص ۲۷۳

۶۲۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۵۔ مسند ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۵۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۰۔ الطبری ج ۳، ص ۲۷۳۔

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو حج میں طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو وہ پیش کرے۔ پورے مجمع میں سے صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے عمروؓ بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اٹھو اور ان سے اپنا بدلہ لے لو۔ عمروؓ بن العاص نے احتجاج کیا کہ آپ گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے آپ سے بدلہ دیتے دیکھا ہے، اے شخص اُٹھ اور اپنا بدلہ لے لے۔" آخر کار عمروؓ بن العاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔[۲۳]

قانون کی بالاتری یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شہری (مسلمان ہو یا ذمی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔ قاضیوں کو اگرچہ رئیسِ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہی مقرر کرتے تھے، مگر ایک شخص قاضی ہو جانے کے بعد خود ان کے خلاف فیصلہ دینے میں بھی ویسا ہی آزاد تھا جیسا کسی عام شہری کے معاملہ میں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت اُبیؓ بن کعب کا ایک معاملے میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حَکَم بنایا۔ فریقین زید کے پاس حاضر ہوئے۔ زید نے اُٹھ کر حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا، مگر حضرت عمرؓ حضرت اُبیؓ کے ساتھ بیٹھے۔ پھر حضرت اُبیؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمرؓ نے دعوے سے انکار کیا۔ قاعدے کے مطابق حضرت زید کو حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہیے تھی، مگر انہوں نے اُن سے قسم لینے میں تامل کیا۔ حضرت عمرؓ نے خود قسم کھائی، اور اس مجلس کے خاتمہ پر کہا "زید قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمرؓ اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔"[۲۴]

ایسا ہی معاملہ حضرت علیؓ کا ایک عیسائی کے ساتھ پیش آیا جس کو انہوں نے کوفہ کے بازار میں اپنی گم شدہ زرہ بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے اپنی

---

[۲۳] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۶۔

[۲۴] بیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۱۰، ص ۱۳۶، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، طبع اول ۱۳۵۵ھ

زرہ اُس سے چھین نہیں لی، بلکہ قاضی کے پاس استغاثہ کیا۔ اور چونکہ وہ کوئی شہادت پیش نہ کر سکے اس لیے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔[۲۵]

ابنِ خلکان کی روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی اور ایک ذمّی فریقین کی حیثیت سے قاضی شُریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی نے اُٹھ کر حضرت علیؓ کا استقبال کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا "یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے"۔[۲۶]

عصبیتوں سے پاک حکومت | اسلام کے ابتدائی دَور کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصول اور اس کی رُوح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ایک طوفان کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مدعیانِ نبوت کے ظہور اور ارتداد کی تحریک میں یہی عامل سب سے زیادہ مؤثر تھا۔ مُسَیلمہ کے ایک پیرو کا قول تھا کہ "میں جانتا ہوں مُسَیلمہ جھوٹا ہے مگر ربیعہ کا جھوٹا مُضَر کے سچے سے اچھا ہے"۔[۲۷] ایک دوسرے مدعیٔ نبوت طُلَیحہ کی حمایت میں بنی غطفان کے ایک سردار نے کہا تھا کہ "خدا کی قسم، اپنے حلیف قبیلوں کے ایک نبی کی پیروی کرنا قریش کے نبی کی پیروی سے مجھ کو زیادہ محبوب ہے"۔[۲۸] مگر اِس ماحول میں جب حضرت ابوبکر (۱۱ھ-۱۳ھ / ۶۳۲ء-۶۳۴ء) اور ان کے بعد حضرت عمرؓ (۱۳-۲۳ھ / ۶۳۴-۶۴۴ء) نے بے لاگ اور غیر متعصبانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل، بلکہ غیر عرب نومسلموں کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ کیا، اور خود اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے سے قطعی مُجتنب رہے، تو ساری عصبیتیں دب گئیں اور مسلمانوں میں وہ بین الاقوامی روح ابھر آئی جس کا اسلام تقاضا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ان

---

[۲۵] حوالہ مذکور

[۲۶] وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۱۶۸، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ ۱۹۴۸ء

[۲۷] الطبری، ج ۲، ص ۵۰۸

[۲۸] ایضاً، ج ۲، ص ۴۸۷

دونوں خلفاء کا طرزِ عمل در حقیقت مثالی تھا

حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب کی یہ قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا "اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی ابی مُعیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے، اور اگر عثمان نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے[۲۹]"۔ اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔ چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو بلا کر ہر ایک سے کہا کہ "اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا[۳۰]"۔ مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لیے انہوں نے جو ہدایات چھوڑیں ان میں دوسری شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی شامل کی کہ منتخب خلیفہ سے عہد لیا جائے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا[۳۱]۔ مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ (۳۵-۲۳ھ - ۵۶-۶۴۴ء) اس معاملے میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے وظیفے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ اُن کے نزدیک یہ صلۂ رحمی کا تقاضا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ "عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں[۳۲]"۔ ابوبکر و عمر بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے

۲۹۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۶۷، دائرۃ المعارف حیدرآباد، طبع دوم

۳۰۔ الطبری، ج ۳، ص ۲۶۴ ۳۱۔ ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۵

۳۲۔ الطبری ج ۳، ص ۲۹۱

تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقربا کو بھی اسی حالت میں رکھیں۔ مگر میں اس میں صلۂ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں[۳۳]" اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوتے، بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافتِ راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ (۳۵ - ۴۰ھ ۶۵۶ - ۶۶۱ء) نے پھر اسی معیار پر کام کرنے کی کوشش کی جو حضرت ابوبکر و عمرؓ نے قائم کیا تھا۔ وہ قبائلی تعصب سے بالکل پاک تھے۔ حضرت معاویہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت اُن کے اندر اس تعصب کی رُوح کو اُبھارنے کی کوشش کی تھی، مگر انہوں نے یہ راہ اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا تھا کہ "قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی (ابوبکرؓ) کیسے خلیفہ بن گیا، تم اُٹھنے کے لیے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں۔" مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ "تمہاری یہ بات اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں، خواہ ان کے دیار اور ان کے اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکرؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس پر مامور نہ ہونے دیتے[۳۴]"۔ یہی حضرت علیؓ کا نقطۂ نظر خلیفہ ہونے کے بعد بھی رہا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ٹھیک اسلامی اصول کے مطابق عربی اور عجمی، شریف اور وضیع، ہاشمی اور غیر ہاشمی، سب کے ساتھ یکساں انصاف کا معاملہ کرنا شروع کیا اور کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ کے مقابلے میں ایسے ترجیحی سلوک سے نوازنا پسند نہ کیا جو دوسرے گروہوں میں رشک و رقابت کے جذبات اُبھار دینے والا ہو۔

۳۳؎ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۲۴

۳۴؎ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۷۴۔ الطبری، ج ۲، ص ۴۴۹۔ ابن عبد البر، الاستیعاب ج ۲، ۶۸۹

رُوحِ جمہوریت اِس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہارِ رائے کی پُوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے۔ وہ خود اپنے اہلِ شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ اُن کی کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ اُن کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔ آزادانہ فضا میں ہر شریکِ مجلس اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ تمام معاملات اہلِ حلّ و عقد کے سامنے بے کم و کاست رکھ دیئے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا۔ فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رُعب و اثر، یا کسی کے مفاد کی پاسداری، یا کسی جتھہ بندی کی بنیاد پر۔ پھر، یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ براہِ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز با جماعت میں، ہر ہفتے ایک دفعہ جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں اُن کو قوم سے اور قوم کو اُن سے سابقہ پیش آتا تھا۔ اُن کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر اُن کے دروازے ہر شخص کے لیے کُھلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے، اور ہٹو بچو کے انتظام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ اِن تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے، اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی، اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کی پہلی ہی تقریر میں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اگر مَیں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو، اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں اِس رائے کا اظہار کیا کہ کسی شخص کو نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مہر باندھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک عورت نے انہیں وہیں ٹوک دیا کہ آپ کو ایسا حکم دینے کا حق نہیں ہے۔ قرآن، ڈھیر سا مال (قنطار) مہر میں دینے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔[۳۵] ایک اور موقع پر بھرے مجمع میں حضرت سلمان فارسیؓ نے

---

[۳۵] تفسیر ابن کثیر، بحوالہ ابو یعلیٰ و ابن المنذر، جلد اوّل، ص ۴۶۷

اُن سے محاسبہ کیا کہ سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے، آپ نے دو چادریں کیسے لے لیں۔ حضرت عمرؓ نے اُسی وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کی شہادت پیش کر دی کہ دوسری چادر انہوں نے اپنے والد کو مستعار دی ہے[۳۶]۔ ایک دفعہ اپنی مجلس میں انہوں نے لوگوں سے پوچھا، اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے۔ حضرت بشر بن سعد نے کہا اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دینگے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تب تو تم کام کے لوگ ہو[۳۷]۔ سب سے زیادہ سخت تنقیدوں سے حضرت عثمانؓ کو سابقہ پیش آیا، اور انہوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں برسرِ عام اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں خوارج کی انتہائی بدزبانیوں کو بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک برسرِ عام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علیؓ کو قتل کر دونگا۔ مگر حضرت علیؓ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بدزبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کارروائی نہیں کرتے محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے[۳۸]۔

خلافتِ راشدہ کا یہ دَور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک روشنی کا مینار تھا جس کی طرف بعد کے تمام اَدوار میں فقہاء، محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے۔

---

[۳۶] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ، للمحب الطبری، جلد ۲، ص ۵۶، طبع مصر۔ سیرۃ عمر بن الخطاب لابن الجوزی، ص ۱۲۷۔

[۳۷] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۴۱۴ [۳۸] المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۱۲۵

افغانستان کا جدید مجوّزہ دستور
بنیادی حقوق اور اسلامی دفعات

ترجمہ: عمر فاروق مودودی

حال ہی میں افغانستان کے لیے جو مسودۂ دستور مرتب ہوا ہے اس کی جو دفعات بنیادی حقوق اور اسلام سے متعلق ہیں ان کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

باب ۱، دفعہ ۲ افغانستان کا مذہب اسلام ہے۔ ریاست اپنے امور فقہ حنفی کے مطابق سرانجام دیتی ہے۔ قوم کے جن افراد کا مذہب اسلام نہیں ہے، وہ اپنی مذہبی رسوم قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اُن حدود کے اندر ادا کرنے میں آزاد ہیں جو عوام کے سکون اور شائستگی کو برقرار رکھنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔

باب ۲، دفعہ ۷ بادشاہ دینِ اسلام کے مقدس اصولوں کا محافظ، مملکت کی آزادی اور سالمیت کا پاسبان، دستور کا نگہبان اور افغانستان کی قومی وحدت کا مرکز ہے۔

دفعہ ۸ بادشاہ لازماً افغانی الاصل، مسلمان اور حنفی المذہب ہونا چاہیے۔

دفعہ ۱۱ خطبوں میں بادشاہ کا نام لیا جائے گا۔

دفعہ ۱۵ بادشاہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، اور سب پر اس کا احترام لازم ہے۔ وہ مندرجۂ ذیل حلف اٹھائے گا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: مَیں حلف اٹھاتا ہوں کہ مَیں اپنے ہر عمل میں اللہ کو حاضر و ناظر سمجھوں گا۔ اسلام کے مقدس اصولوں کی حفاظت کروں گا۔ دستور کی حفاظت کروں گا۔ مملکت کی سالمیت کی حفاظت کروں گا۔ ملک کی آزادی کی حفاظت کرونگا۔ بیاست کے

قوانین اور عوام کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ اور خدا سے توفیق مانگتے ہوئے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں افغانستان کے دستور کے مطابق حکومت کروں گا اور اپنی تمام تر مساعی افغان قوم کی فلاح اور ترقی کے لیے وقف کر دوں گا۔"

باب ۳، دفعہ ۲۵۔ افغان عوام بلا ترجیح و امتیاز قانون کے تحت یکساں حقوق و فرائض کے مالک ہیں۔

دفعہ ۲۶۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس حق کی کوئی حدود بجز اس کے نہیں ہیں کہ وہ دوسرں کی آزادی پر اثر انداز نہ ہو اور مفاد عامہ اس سے متاثر نہ ہو جس کی صراحت قانون میں کر دی گئی ہے۔

—— انسان کی آزادی اور اس کا ناموس دونوں محفوظ و مامون ہیں۔

—— ریاست انسان کی آزادی اور ناموس کی عزت اور حفاظت کرنے کی پابند ہے۔

—— کوئی فعل جرم نہیں سمجھا جاتے گا اَلّا یہ کہ وہ کسی ایسے قانون کی رُو سے جرم ہو جو اس فعل کے وقوع میں آنے سے قبل نافذ ہو چکا ہو۔

—— کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک کہ کوئی عدالتِ مجاز کھلا مقدمہ چلا کر اس کو سزا نہ دے دے۔

—— کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی بجز ایسے قانون کی شرائط کے تحت جس کا اعلان ملزم کی طرف منسوب فعل کے وقوع پذیر ہونے سے قبل کر دیا گیا ہو۔

—— کسی پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا، نہ کسی کو گرفتار کیا جا سکتا ہے مگر قانون کی شرائط کے مطابق۔

—— کسی کو زیرِ حراست نہیں رکھا جا سکتا مگر کسی عدالتِ مجاز کے جاری کردہ احکام کے تحت جو قانون کی شرائط کے مطابق ہوں۔

—— برادت حالتِ اصلی ہے۔ ملزم معصوم تصور کیا جائے گا اِلّا یہ کہ کوئی عدالت حکمِ صریح کے ذریعہ سے اسے مجرم گردانے۔

ــــــ کسی جُرم کا ارتکاب فعل ذاتی ہے۔ ملزم پر مقدمہ چلانا، اسے گرفتار کرنا یا نظر بند کرنا اور سزا سنانا خود مجرم کے سوا کسی دوسرے شخص کو متاثر نہیں کرتا۔

ــــــ کسی انسان کو جسمانی اذیت دینا جائز نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی شخص کو نہ ایذا پہنچا سکتا ہے نہ ایذا پہنچانے کا حکم دے سکتا ہے خواہ وہ سچی بات اُگلوانے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ وہ ملوث شخص زیرِ تفتیش، زیرِ حراست، نظر بند یا سزا یاب ہی کیوں نہ ہو۔

ــــــ کوئی ایسی سزا دینا جائز نہیں ہے جو انسان کی عزت اور اس کے وقار کے خلاف ہو

ــــــ وہ شہادت ناقابلِ اعتبار ہے جو کسی ملزم سے یا کسی بھی شخص سے جبر کر کے یا ڈرا دھمکا کر حاصل کی گئی ہو۔

ــــــ کسی جُرم کا اعتراف ملزم کا وہ اقرارِ حقائق ہے جو کسی عدالتِ مجاز کے سامنے اس نے اپنی مرضی سے بقیامِ ہوش وحواس کیا ہو۔

ــــــ ہر شخص مجاز ہے کہ قانون کے تحت اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی تردید کرنے کے لیے وکیلِ صفائی حاصل اور مقرر کرے۔

ــــــ کسی شخص کے قرض کی عدم ادائی مقروض کو اس کی کلی یا جزئی آزادی سے محروم نہیں کر سکتی۔ قرضوں کی وصولیابی کے طُرُق و ذرائع کی صراحت قانون میں کر دی گئی ہے۔

ــــــ ہر افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، ریاست کی قلمرو میں سفر کرنے اور سکونت اختیار کرنے کا مجاز ہے سوائے ان علاقوں کے جو قانوناً ممنوع ہوں۔

ــــــ ہر افغان قانون کی شرائط کے مطابق، افغانستان سے باہر جانے اور واپس آنے کا حق رکھتا ہے۔

ــــــ کسی افغان کو افغانستان سے ملک بدر کرنے کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

دفعہ ۲۷ | کسی افغان کو جس پر کسی جرم کا الزام ہو کسی بیرونی ریاست کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ ۲۸ | ذاتی جائے سکونت سے تعرّض نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی شخص بشمول سرکاری اہلکار، کسی شخص کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر، یا کسی عدالت مجاز کے جاری کردہ احکام کے بغیر، یا قانون میں صراحت شدہ مقاصد و شرائط کی عدم موجودگی میں، نہ داخل ہو سکتا ہے، نہ اس کی تلاشی لے سکتا ہے۔

— ثابت شدہ جُرم کی صورت میں متعلقہ افسر کسی شخص کے گھر میں، اس کی مرضی کے بغیر، یا پہلے سے حاصل کردہ عدالتی اجازت کے بغیر محض اپنی ذمّے داری پر داخل ہو سکتا ہے اور تلاشی لے سکتا ہے۔ تاہم مکان میں داخلے اور تلاشی کے بعد متعلقہ افسر کو قانون میں تجویز کردہ وقت کے اندر اندر عدالت کا فیصلہ حاصل کر لینا چاہیے۔

دفعہ ۲۹ | ذاتی ملکیت محفوظ ہے۔

— کسی کی ذاتی املاک قانون کی شرائط اور عدالتِ مجاز کے فیصلے کے بغیر ضبط نہیں کی جاسکتیں۔

— ذاتی املاک سرکاری ضروریات کے لیے حاصل کی جاسکتی ہیں، مگر صرف اس صورت میں جبکہ ایسا کرنا مفادِ عامہ کا مقتضا ہو اور قانون کا مقرر کردہ منصفانہ معاوضہ ادا کر دیا جائے۔

— مفادِ عامہ کی خاطر، قانون کے ذریعے سے ذاتی املاک کو محدود کیا جاسکتا ہے اور اس سے انتفاع کو نظم کا پابند کیا جاسکتا ہے اور اس کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔

— کسی کو اکتسابِ املاک اور اس سے انتفاع سے روکا نہیں جاسکتا مگر قانون کی حدود میں رہتے ہوئے۔ مفادِ عامہ کے تحفّظ کی خاطر استعمالِ املاک کا طریقہ قانون کے ذریعہ پابندِ قواعد و رہنمائی کیا جائے گا۔

— ذاتی املاک کے اعلان کے متعلق چھان بین قانون کی شرائط کے مطابق کی جاسکتی ہے

دفعہ ۳۰ | افراد کی آزادیِ مراسلت اور اس میں رازداری کا حق ناقابلِ دخل اندازی ہے، خواہ یہ مراسلت بذریعہ ڈاک، ٹیلیفون یا تار ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔

— ریاست کو ذاتی پیغام رسانی میں تجسّس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر قانون کی شرائط

کے مطابق کسی عدالتِ مجاز کے جاری کردہ فیصلے کی مطابقت میں۔

—— ہنگامی صورتِ حال میں جس کی صراحت قانون میں کر دی گئی ہے۔ ذمہ دار افسر پہلے سے حاصل کردہ عدالتی اجازت کے بغیر محض اپنی ذمہ داری پر ذاتی خطوط کی چھان بین کر سکتا ہے لیکن وہ پابند ہے کہ چھان بین کرنے کے بعد قانون میں مقرر کردہ وقت کے اندر عدالت کا فیصلہ حاصل کرے۔

دفعہ ۳۱ | آزادیٔ خیال اور آزادیٔ اظہارِ خیال ناقابلِ دخل اندازی ہے۔

—— ہر افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، اپنے خیالات کا اظہار زبانی طور پر، تحریری طور پر، تصویر کی شکل میں، اور اسی طرح کے دوسرے ذرائع سے کرنے کا حق رکھتا ہے۔

—— ہر افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، حکام کو پہلے سے دکھائے بغیر، مواد طبع کرنے اور شائع کرنے کا حق رکھتا ہے۔

—— عام مطابع کے قیام اور مطبوعات کی اشاعت کی اجازت اور رعایت، قانون کی شرائط کے مطابق صرف ریاست کو اور افغانستان کے شہریوں کو دی جاتی ہے۔

—— صرف ریاست ہی کو ریڈیو اور ٹیلیویژن اسٹیشن قائم کرنے کا حق ہے۔

دفعہ ۳۲ | افغان شہری جائز اور پُرامن مقاصد کے لیے، قانون کی شرائط کے مطابق اور پہلے سے سرکاری اجازت لیے بغیر، جمع ہونے کے حق دار ہیں۔

—— افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، مادی یا غیر مادی مقاصد کے حصول کے لیے انجمنیں قائم کرنے کے حق دار ہیں۔

—— افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، سیاسی جماعتیں بنانے کے حق دار ہیں، بشرطیکہ:

(ا) جماعت کے مقاصد اور سرگرمیاں اور اس کے نظریات اُن اقدار سے متصادم نہ ہوں جو دستور میں مندرج ہیں۔

(ب) جماعت کی تنظیم اور مالی وسائل خفیہ نہ ہوں۔

——ایک ایسی جماعت جو قانون کی شرائط کے مطابق قائم کی گئی ہو، قانونی وجوہ اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے بغیر توڑی نہیں جا سکتی۔

دفعہ ۳۳ | ہر وہ شخص جسے انتظامیہ کی جانب سے بلا وجہ کوئی نقصان پہنچا ہو، معاوضے کا حق دار ہے اور اپنے نقصان کی تلافی کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہے۔

——ریاست اپنے واجبات کی وصولی کے لیے، ان حالات کے سوا جن کی صراحت قانون میں کر دی گئی ہے، کسی عدالتِ مجاز کے حکم کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔

دفعہ ۳۴ | تمام افغان اس تعلیم کے حق دار ہیں جو ریاست اور افغانستان کے شہریوں کی جانب سے مفت بہم پہنچائی جاتی ہے۔

——ریاست کا مقصود اس ضمن میں اس درجے تک پہنچ جانا ہے جہاں قانون کی شرائط کے مطابق، ہر افغان کو تعلیم کی کافی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

——تعلیم کی نگرانی اور رہنمائی ریاست کا فرض ہے۔

——جن مقامات میں ریاست کی جانب سے پرائمری تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں وہاں تمام بچوں کے لیے پرائمری تعلیم لازمی ہے۔

——صرف ریاست ہی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے اور اسی کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ پبلک اسکول اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کرے اور چلائے

——اس دائرے سے باہر افغان پرائیویٹ اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے حق دار ہیں۔ اس قسم کے اسکولوں کے قیام، نصاب اور مدتِ تعلیم کا تعین قانون کے ذریعہ کیا جائے گا۔

——ریاست غیر ملکیوں کو، قانون کی شرائط کے مطابق، ایسے پرائیویٹ اسکول قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جو صرف غیر ملکیوں کے لیے ہوں۔

دفعہ ۳۵ | حکومت قومی زبان پختو کی تقویت و ترقی کے لیے ایک موثر منصوبہ تیار کرے گی اور اسے

بروئے کار لائے گی۔

دفعہ ۳۶ | ریاست اپنے وسائل کی حد تک، تمام افغانوں کو علاج اور امراض کی روک تھام کی سہولتیں فراہم کرنے کی پابند ہے۔ اس ضمن میں ریاست کا مطمحِ نظر ایک ایسے درجے تک پہنچ جانا ہے جہاں تمام افغانوں کو کافی طبی سہولتیں میسر ہوں۔

دفعہ ۳۷ | ہر وہ افغان جو جسمانی لحاظ سے صحیح وسالم ہے کام کرنے کا حق رکھتا ہے اور یہ اس کا فرض بھی ہے۔ مزدوروں کی تنظیم کے لیے جو قوانین وضع کیے گئے ہیں ان کا بنیادی مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہے جن میں محنت کاروں کے مختلف طبقوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو، روزگار کے مناسب مواقع مہیا کیے جائیں اور آجروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات مساوی اور ارتقائی بنیاد پر منظم کیے جائیں۔

—— ریاست افغانوں کو ان کی قابلیت کی بنیاد پر اور قانون کی شرائط کے مطابق ملازم رکھتی ہے۔ پیشے اور صنعت کے انتخاب کی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے آزادی ہے۔

—— جبری محنت ناجائز ہے خواہ وہ ریاست ہی کے لیے کیوں نہ درکار ہو۔

—— جبری محنت کی ممانعت اُن قوانین کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی جو مفادِ عامہ کی خاطر اجتماعی جدوجہد کی تنظیم کے لیے جاری کیے جائیں۔

دفعہ ۳۸ | ہر افغان ریاست کو ٹیکس اور واجبات ادا کرنے کا پابند ہے۔ کوئی ایسا ٹیکس اور محصول نہیں لگایا جا سکتا جو قانون کی شرائط کے مطابق نہ ہو۔ ٹیکس کی مقدار اور ادائی کے طریقۂ کار کا تعین قانون کے ذریعے سماجی انصاف کے مطابق کیا جائے گا۔

—— ان شرائط کا اطلاق غیر ملکیوں پر بھی ہوگا۔

دفعہ ۳۹ | —— ارضِ وطن کا دفاع تمام افغانوں کا مقدس فرض ہے۔

—— تمام افغان، قانون کی شرائط کے مطابق، فوجی خدمات انجام دینے کے پابند ہیں۔

باب ۴، دفعہ ۴۶ | کوئی ایسا قانون جاری نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے اصولوں سے اور ان اصولوں

سے جو اس دستور میں درج کیے گئے ہیں متصادم ہو۔

دفعہ ۶۹ | بجز اُن معاملات کے جن سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے اس دستور میں خاص طور تفویض کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ باقی تمام معاملات میں قانون سے مراد وہ قرارداد ہے جس کی منظوری دونوں ایوانہائے پارلیمان دے چکے ہوں اور جس پر شاہ کے دستخط ہو چکے ہوں اور جن معاملات میں ایسی کوئی قرارداد موجود نہ ہو وہاں قانون سے مراد شریعتِ اسلامیہ کے مذہب حنفی کی دفعات ہوں گی

باب ۷، دفعہ ۱۰۲ | عدالتیں ان مقدمات میں جو ان کے سامنے پیش ہوں، اس دستور کی دفعات اور ریاستی قوانین کا اطلاق کریں گی۔ ایسی صورت میں جبکہ کسی مسئلے سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے دستور اور ریاستی قوانین کی دفعات موجود نہ ہوں، عدالتیں اِس دستور کی مقرر کردہ حدُود کے اندر رہتے ہوئے شریعتِ اسلامیہ کے مذہبِ حنفی کے اصولوں کے مطابق فیصلہ کریں گی۔

باب ۱۰، دفعہ ۱۲۰ | اس دستور کے وہ اصول جو اسلامی عقائد و احکام کی پابندی سے متعلق ہیں اور آئینی شہنشاہیت کی بنیاد، اُن دفعات کے مطابق جو اس دستور میں درج ہیں، اور وہ اقدار جن کی تصریح باب دوم کی دفعہ ۸ میں کی گئی ہے، ناقابلِ ترمیم ہیں۔

رسائل و مسائل

کیا حضرت علیؓ کے لیے سورج کو لوٹایا گیا تھا؟

سوال: ترجمان القرآن اکتوبر ۶۳ء میں حاشیہ تفہیم ۳۵ میں ان احادیث پر بحث کی گئی ہے جن میں سورج کو واپس لوٹائے جانے کا ذکر ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نمازِ عصر فوت ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے دعا فرمائی، سورج واپس آگیا، آپ نے نماز ادا کی۔ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ امام ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ جوزیؒ نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے اس کو بے اصل کہا ہے۔

اس روایت پر میں نے جو تحقیق کی ہے وہ یہ ہے:۔ ابی جعفر طحاوی احمد بن محمد مصری حنفی نے جلد دوم مشکل الآثار ص۱۲ میں اس پر بحث کی ہے۔ اس روایت اور حضرت یوشع بن نون کے لیے جو سورج کو رد کیا گیا تھا، دونوں میں تطبیق دی ہے۔

اس حدیث کے ایک راوی محمد بن موسیٰ ہیں جن کے متعلق لکھتے ہیں محمود فی الروایۃ الخ... محمد بن عون اور ام جعفر اہل بیت سے ہیں۔ صادق اور مقبول الروایۃ ہیں۔ اور اس حدیث کو محدثین نے علاماتِ نبوت میں بڑی علامت قرار دیا ہے (مشکل الآثار ج دوم روایات ردِ شمس وغیرہ)۔ اسی طرح حنفی فقہ کی مشہور کتاب طحطاوی علی نور الایضاح میں اوقاتِ صلوٰۃ کی بحث میں یہ سوال اٹھایا ہے۔ ولو غربت الشمس ثم عادت ھل یعود الوقت؟ الظاھر نعم کما فی الدرر الخ۔ اس کے ثبوت میں وہی حضرت علیؓ والی روایت نقل کی ہے۔ اور اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں نقلہ طبرانی بسند حسن وصححہ الطحاوی والقاضی عیاض واخطأ من جعلہ موضوعًا کابن الجوزی

کما فی المشہر طحاوی ص ۹۵

اسی طرح نور الانوار میں بحث وقت میں ان روایات کو لیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث نہ تو موضوع ہے اور نہ بے اصل۔

اگر سب قارئین کے لیے مفید خیال فرمائیں تو اس کا جواب ترجمان میں دے دیں۔

جواب:۔ ردّ الشمس سے متعلق روایات پر محض مشکل الآثار طحاوی، اور نور الانوار کی اجمالی بحثیں مطالعہ فرما کر اگر آپ نے یہ خیال کر لیا ہے کہ اس سے تحقیق کا حق ادا ہو گیا ہے، سند و متن کے جملہ اشکالات رفع ہو گئے ہیں اور ان روایات کی صحت ثابت ہو گئی ہے، تو آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اسی طرح ان مختصر بحثوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا بھی صحیح نہیں ہے کہ فقط ابن جوزی یا ایک آدھ دوسرے محدث نے ان روایات کو موضوع یا ضعیف قرار دیا ہے اور دوسروں کے نزدیک یہ صحیح یا قوی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے لیے سورج لوٹائے جانے والی ساری روایات ائمہ حدیث اور اصحاب جرح و تعدیل کے نزدیک نہایت ہی ضعیف بلکہ موضوع و مکذوب ہیں اور ان روایات کا کوئی ایک طریق بھی محفوظ اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

ابنِ تیمیہؒ نے ان روایات پر جو تنقید کی ہے وہ ان کی تصنیف "منہاج السنہ" میں موجود ہے۔ منہاج السنہ کا عام متداول نسخہ امام ذہبیؒ کا تلخیص کردہ ہے اور "منتقی منہاج السنہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس طرح اس مختصر نسخے کو گویا دو جلیل القدر محدثین کی سندِ توثیق حاصل ہے۔ اس کتاب کی فصل ثالث (ص ۵۲۴ تا ۵۲۸) میں "خرافۃ ردّ الشمس لعلی مرتین بعد غروبھا" کے زیرِ عنوان امام ابنِ تیمیہؒ نے ان روایات پر بحث کرتے ہوئے ان کے متعدد سلسلے نقل کیے ہیں اور ان میں وہ بھی شامل ہیں جو امام طحاویؒ نے مشکل الآثار میں دیے ہیں۔ ان میں سے ہر سلسلے کے راویوں پر ابن تیمیہؒ نے ابنِ حبان، ابو حاتم، ابن عدی، دارقطنی اور شعبہ وغیرہ کی شدید جرح کو الگ الگ بیان کیا ہے اور اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

عِلْمُنا ليقيني بفضل علیؓ لا يحتاج معه هٰذا الكذب فأما رد الشمس له في زمن النبیؐ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقد ذكره طائفة بلفظ آخر كالطحاوي والقاضي عياض وغيرهما وعدوا ذٰلك من معجزات الرسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم لكن الحذاق يعلمون ان هٰذا لم يكن -	حضرت علیؓ کی فضیلت کے بارے میں ہم جو یقینی علم رکھتے ہیں وہ اس طرح کے جھوٹ کا محتاج نہیں ہے - جہاں تک عہدِ نبوی میں ان کے لیے سورج لوٹائے جانے کا تعلق ہے ۔ اس کا ذکر بعض حضرات مثلاً طحاوی، قاضی عیاض وغیرہ نے کیا ہے اور اسے معجزاتِ رسول میں شمار کیا ہے - لیکن فنِ حدیث کے ماہرین جانتے ہیں کہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے ۔

اس موضوع سے متعلق روایات پر اس سے زیادہ مفصل اور مکمل بحث حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ جزسادس میں کی ہے - اس جز کا بیشتر حصہ معجزاتِ نبویؐ کے لیے وقف ہے اور اس میں مصنف نے پوری جامعیت کے ساتھ تمام متعلقہ احادیث و آثار کو نقل کر دیا ہے - اس میں " دلائل النبوۃ الحسیہ " کے عنوان کے تحت آفتاب کے روکے جانے یا لوٹائے جانے والی جملہ روایات پر نہایت شافی اور مبسوط نقد و بحث موجود ہے جو گیارہ بڑے ۷۶ تا ۸۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے - اس میں جن اصحابِ رجال کی کثیر تعداد نے ان تمام سلسلہ ہائے اسناد کو ضعیف بلکہ وضعی قرار دیا ہے ان میں دارقطنی، ابن حبان، ابن عدی، یحییٰ بن معین، ابن عساکر، ابن ناصر بغدادی، ذہبی، شعبہ، ابن زنجویہ، دارمی، نسائی، ابو حاتم رازی، المزی، ابن حزم، ابنِ جوزی، ابن مبارک، ابن مہدی، ابوزرعہ، بخاری، ابو داؤد، جوزجانی جیسے جلیل القدر ائمہ شامل ہیں - اس طویل بحث کے دوران میں ایک مقام پر ابن کثیر اس موضوع پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں :

في نزول الائمة كمالك واصحاب الكُتُب السِتّة واصحاب المسانيد والسنن والصحاح والحسان روايته هٰذا الحديث وايداعه في كتبهم اكبر دليل على انه لا	امام مالک، مصنفینِ صحاحِ ستہ، اصحابِ مسانید و سُنن اور دیگر صحیح اور حسن احادیث کے جامعین کا اس ردِّ شمس والی حدیث کا ترک کر دینا اور اپنی کتابوں میں اسے درج نہ کرنا اس بات کا سب سے

اصل له عندهم وهو مفتعل ما نوك بعدهم وهذا ابو عبد الرحمن النسائی قد جمع کتابا فی خصائص علی بن ابی طالب ولم یذکره وکذالک لم یروه الحاکم فی مستدرکه وکلاهما ینسب الی شیء من التشیع ولا رواه من رواه من الناس المعتبرین الاعلی سبیل الاستغراب والتعجب ۔۔۔ والائمة فی کل عصر ینکرون صحة هذا الحدیث و یردونه ویبالغون فی التشنیع علی رواته کما قدمنا من غیر واحد من الحفاظ۔

بڑا ثبوت ہے کہ ان سب کے نزدیک یہ بے اصل ہے اور ان کے بعد جھوٹ موٹ گھڑ لی گئی ہے۔ امام نسائی کو لیجیے جنہوں نے حضرت علی ابن ابی طالب کے خصائص و فضائل میں ایک کتاب مرتب کی ہے، لیکن انہوں نے بھی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح حاکم نے بھی اپنی کتاب مستدرک میں اسے درج نہیں کیا، حالانکہ دونوں کی طرف ایک حد تک تشیع کو منسوب کیا جاتا ہے معتبر محدثین میں جس نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے، محض اظہار تعجب اور اچنبھے کے طور پر کیا ہے اور ہر عہد میں ائمہ حدیث نے اس روایت کی صحت کا انکار کیا ہے، اسے رد کیا ہے اور اس کے راویوں پر شدید طعن و تشنیع کی ہے، جیسا کہ ہم پہلے بہت سے محدثین سے نقل کر چکے ہیں۔

امام طحاوی کی اخذ کردہ روایات میں سے جو نسبتہً قابلِ اعتماد ہو سکتی تھی اُس پر بھی جرح کرتے ہوئے ابن تیمیہؒ اور ابن کثیر دونوں نے اس میں تدلیس و تعلیل کی نشان دہی کی ہے۔ ابن کثیر نے مزید لکھا ہے:

والطحاوی رحمه الله وان کان قد اشتبه علیه امره فقد روی عن ابی حنیفه رحمه الله انکاره والتهکم بمن رواه۔

اگرچہ طحاوی رحمہ اللہ پر اس روایت کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے، لیکن ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اس کے راویوں کے خلاف اظہارِ نکیر و نفرت منقول ہے۔

امام طحاوی کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ کا یہ قول جسے ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے، قابلِ ذکر

ہے کہ لم یکن عندہ نقل جید للاسانید کجہابذۃ الحفاظ (ان کے پاس جانچ پرکھ کرنے والے زبردست محدثین جیسا عمدہ سلسلہ اسناد نہیں تھا)

امام ابوحنیفہ کا اس روایت پر انکار و اعتراض سند کے ساتھ نقل کرتے ہوئے ابنِ کثیر فرماتے ہیں:

فھذا ابو حنیفۃ رحمہ اللہ وھو من الائمۃ المعتبرین وھو کوفی لا یتھم علی حب علی ابن طالب و تفضیلہ بما فضلہ اللہ و رسولہ و ھو مع ھذا ینکر علی راویہ۔

یہ ہیں ابوحنیفہ رحمہ اللہ جو کہ ائمۂ معتبرین میں سے ہیں اور کوفی ہونے کی وجہ سے انہیں حضرت علیؓ سے محبت رکھنے اور خدا و رسول کی عطا کردہ فضیلتِ علیؓ کا معترف ہونے کے معاملے میں مطعون نہیں کیا جا سکتا، ہیں کے باوجود وہ اس روایت کے راوی پر معترض ہیں۔

امام طحاوی وغیرہ نے جن روایتوں کی مدافعت کی ہے، ان کی سند پر تو مختصر گفتگو ہو چکی، لیکن سند کے علاوہ ان کا متن اور مضمون بھی درایۃً محلِ نظر ہے۔ مناسب یہ ہو گا کہ اس پہلو پر اپنے لفظوں میں کچھ کہنے کے بجائے ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ کثیر ہی کے الفاظ نقل کر دیئے جائیں۔ ابنِ تیمیہؒ سابق الذکر بحث ہی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

لکن الشان ھل وقع ھذا الحادث العظیم ان الشمس غربت ثم طلعت وما نقلہ اھل التواتر کما نقلوا انشقاق القمر ... ثم نفس غروب الشمس یخرج الوقت المضروب للصلوٰۃ فالمصلی بعد ذالک لا یکون مصلیاً فی الوقت و لو عادت وطلعت بعد غروبہا حصل بغروبہا افطار الصائم و صلوٰۃ المسلمین المغرب۔ فبعد طلوعہا ایبطل صوم الصائم

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اتنا عظیم واقعہ رونما ہو گیا۔ کہ سورج غروب ہو گیا اور پھر طلوع ہوا اور اہلِ تواتر نے اسے اس طرح نقل نہیں کیا جس طرح شق القمر کو کیا ہے؟ ..... پھر سورج کا مجرد غروب ہو جانا نمازِ عصر کے وقت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد نمازی کی نماز وقت پر ادا نہیں ہو سکتی خواہ سورج غروب کے بعد دوبارہ لوٹ آئے۔ غروب کے بعد روزے دار روزہ کھول سکتا ہے اور مغرب کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ کیا دوبارہ سورج نکلنے پر

وصلوٰته وهٰذا التقدير ماله يوجد — وہ روزہ اور نماز باطل ہو گئی ؟ یہ ایک ناممکن مفروضہ ہے ۔

اس کے بعد ابن تیمیہؒ نے ان غزوات کا ذکر کیا ہے جن میں نیند یا شدید مشغولیت میں نماز قضا ہو گئی ۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت علیؓ بھی موجود تھے ، لیکن وہاں اللہ نے سورج کو لوٹا کر رات کو دن اور دن کو رات میں تبدیل نہیں کیا ، بلکہ نماز قضا ادا کی گئی ۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں ابن کثیر نے بھی دہرایا ہے اور مزید فرمایا ہے کہ جن صحابہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مرتبہ بنو قریظہ میں جا کر نماز عصر پڑھنے کی ہدایت فرمائی تھی اور اس پر لفظاً عمل کرتے ہوئے انہوں نے راستے میں نماز ادا نہیں کی تھی حالانکہ سفر ہی میں سورج ڈوب گیا تھا ، بلکہ بنو قریظہ کی بستی میں پہنچ کر مغرب کے بعد نماز عصر پڑھی تھی ، ان کے لیے اگر سورج واپس نہیں ہوا تو حضرت علیؓ کے لیے کیسے ہو گیا ؟ پھر حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

وكيف يدخل فى عقل احد من اهل العلم ان يكون هٰذا الحديث يرويه على ابن ابى طالب وفيه منقبة عظيمة له ودلالة معجزة باهرة لرسول الله صلى الله عليه وسلم ثم لا يروى عنه الا بهذا الاسناد . . . كيف يقع مثل هٰذا نهاراً جهرة وهو مما تتوفر الدواعى على نقله ثم لا يروى الا من طرق ضعيفة منكرة واكثرها مركبة موضوعة ۔

کسی اہل علم کی عقل میں یہ بات کیسے آسکتی ہے کہ اس حدیث کے حضرت علیؓ آپ ہی راوی ہوں ، اس میں ان کی عظیم منقبت اور ایک زبردست معجزۂ نبوی کا بیان ہو اور پھر ان کی طرف سے اس طرح کی سند کے ساتھ اسے آگے روایت کیا جائے ؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ دن کی روشنی میں علانیہ پیش آئے ، اس کے نقل کیے جانے کے اسباب و وجوہ اور محرکات بھی بہت سے ہوں ، لیکن اس کے باوجود اس روایت کے سارے طرق ضعیف و منکر ، بلکہ اکثر بناوٹی اور موضوع ہوں ۔

آگے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ سورج کا غروب کے بعد مغرب سے نکلنا تو قربِ قیامت کی سب سے بڑی علامت ہے ، وہ کوئی معمولی واقعہ تو نہیں ہے کہ بس یونہی ظاہر ہو کر گزر جائے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے

مطبُوعات

DIPLOMACY IN ISLAM تالیف۔ جناب افضل اقبال صاحب۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۱۵۶۔ قیمت دس روپے۔

کتاب کے فاضل مصنّف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں اور تقریروں کو جس سلیقے سے انہوں نے مرتب کیا ہے وہ ملک اور بیرونِ ملک میں خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اُن کے مطالعہ کی وسعت اور اسلام سے نہ صرف گہری واقفیت بلکہ اس سے وابستگی کی بھی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ وہ چونکہ خود پاکستان کے سفارتی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اُن کی تصریحات زیادہ ٹھوس اور جاندار ہیں۔

اس قابلِ قدر تصنیف میں انہوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اسلام میں مغربی طرزِ فکر کے برعکس ڈپلومیسی سے مراد چالاکی، عیاری اور فریب کاری نہیں بلکہ بین الاقوامی پیچیدگیوں کو خلوص، دیانت اور فہم و فراست سے حل کرنے کی کوشش ہے۔ فاضل مصنّف نے اسلام کے اس امتیازی اصول کی حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیّبہ سے وضاحت فرمائی ہے اور حضور کے صلح ناموں اور آن کی مصالحانہ کوششوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن کے نزدیک اصول اور عہد کی پابندی کتنی ضروری ہے اور انہیں کسی بڑی سے بڑی مصلحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسلام کی تعلیمات کا اعجاز ہے کہ انسان نے بین الاقوامی معاہدوں میں خلوص، دیانت اور امانت کا سبق سیکھا ہے۔

پھر اسلامی تعلیمات نے ایسے سُفرا کو جنم دیا ہے جن کی کامیابی کا معیار عیاری اور فریب کاری اور منافقت نہ تھا بلکہ شرافت، اخلاص، سچائی، حق گوئی اور ذہانت و فطانت تھا۔ وہ جو بات

کہتے بڑے واضح الفاظ میں دل کی گہرائیوں سے کہتے اور کسی معاملے میں مکر و فریب سے کام نہ لیتے تھے۔ فاضل مصنف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"حضور سرورِ کائنات کی نظر میں سفارتی حکمتِ عملی بذاتِ خود مقصد نہ تھی بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ذرائع کو بھی وہی مقام حاصل تھا جو خود مقاصد کو تھا۔ نیک اور مقدس مقصد جو پاکیزہ قربانی کا طالب ہو وہ غیر مقدس ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر حضور سرورِ دو عالم نے سفارتی حکمتِ عملی کو اخلاقی بنیادوں پر استوار فرمایا۔" (ص ۱۰۶)

وہ ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"اسلام نے زندگی کے سارے شعبوں کے لیے واضح اور قطعی اصول پیش کیے ہیں۔ متعلقہ فریق خواہ فرد ہو یا قوم، معاملہ خواہ ذاتی نوعیت کا ہو یا سیاسی نوعیت کا، شخص خواہ عزیز ہو یا اجنبی، دشمن ہو یا دوست، اپنی قوم یا نسل سے تعلق رکھنے والا ہو یا اس سے بیگانہ، وقت خواہ جنگ کا ہو یا امن کا۔ کسی حال میں یا کسی مصلحت کے تحت عہد و پیمان کا توڑنا درست نہیں۔" (ص ۱۱۲)

"مسلمانوں کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے بیچارگی کے عالم میں جس معاہدے پر دستخط ثبت کیے قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد بھی اُس کا پُوری طرح احترام کیا۔" (ص ۱۱۵)

یُوں تو یہ ساری کتاب بڑی قابلِ قدر ہے لیکن اس کا آخری باب جس کا عنوان اخلاقی ڈپلومیسی ہے خاص طور پر فکر انگیز اور مصنف کی اسلام کے مزاج سے گہری واقفیت کی غمازی کرتا ہے۔ آغاز میں پاکستان سپریم کورٹ کے فاضل جج جناب ایس۔ اے رحمٰن صاحب کا ایک مختصر مگر جاندار مقدمہ ہے جو اس کتاب کے وقیع ہونے کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے لیکن اس کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ (ع۔ ح۔ ص)

علم و عمل جلد اوّل | تالیف جناب عبدالقادر رخانی۔ ترجمہ: مولوی معین الدین صاحب افضل گرھی۔ ترتیب و حواشی: محمد ایوب قادری بی، اے۔ شائع کردہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ملنے کا پتہ: ۱۴۲/۱ وحید آباد، کراچی نمبر ۱۸۔ قیمت آٹھ روپے۔ صفحات: ۴۰۰۔

زیر تبصرہ کتاب مولوی عبدالقادر رام پوری کے وقائع کا مرقع ہے۔ یہ مجموعہ انیسویں صدی کے آغاز میں متحدہ ہند کے سیاسی، معاشرتی اور علمی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے اس حسرتناک دور کا نقشہ آجاتا ہے جب اس ملک میں مسلمانوں کی بساط لپیٹی جا رہی تھی اور فرنگی اقتدار بڑی سُرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں روہیل کھنڈ، بنگال اور دہلی کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ چھ ابواب پر منقسم ہے (۱) مؤلف کے خاندانی اور تعلیمی حالات (ب) سفر بنگال اور باقی چار ابواب میں دہلی اور مضافاتِ دہلی کے مفصّل حالات بیان کیے گئے ہیں یُوں تو یہ ساری کتاب عمدہ اور معلومات سے پُر ہے اور اس میں واقعات کے بعض ایسے گوشے سامنے آجاتے ہیں جو ہمارے مؤرخین کی نظروں سے ابھی تک مستور ہیں لیکن اس کا وہ حصہ جو علمائے ہند کے تذکرے پر مشتمل ہے بڑا اہم ہے۔ فاضل مرتب نے اسے بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ شروع میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ایک قابلِ قدر "تعارف" بھی درج ہے جو اس کتاب کی اہمیت کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ (ع۔ ح۔ ص)

جماعت اسلامی انصاف کے ترازو پر | مترجم و مؤلف: تنزیل الرحمٰن۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ۔ ناشر: پاکستان پبلشنگ ہاؤس۔ کچہری روڈ۔ کراچی ملنے کا پتہ: پاکستان لاہاؤس کچہری روڈ۔ کراچی۔ قیمت: سوا دو روپیہ۔

جماعت اسلامی اس لحاظ سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے کہ اس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کبھی توڑ پھوڑ، اکھاڑ پچھاڑ، ہنگامہ آرائی اور رہزل و ابتذال کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ سانحۂ تقسیم سے لے کر آج تک مساعد و نامساعد حالات میں جماعت نے ہمیشہ سنجیدہ، معقول اور آئینی جدوجہد کا طریقۂ کار ہی اختیار کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء سے لے کر ۶ جنوری ۱۹۶۴ء تک اس طریقۂ کار کی آزمائش جماعت کو اشتعال انگیزی کی بھٹی میں ڈال کر اور پروپیگنڈے کی سان پر رکھ کر کی گئی۔ اس کے بعد ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو اس آزمائش نے ایک آخری اور قطعی صورت اختیار کی، یعنی جماعت کو خلافِ قانون قرار دے کر توڑ دیا گیا اور اس کی مجلسِ شوریٰ کے تمام ارکان کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس موقع پر جماعت کے سامنے صرف تین راستے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ایک تو وہی توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی، جس کی توقع شاید فطری طور پر، جماعت کے دوست اور دشمن دونوں ہی رکھتے تھے۔ دوستوں کو گلہ تھا کہ ایسا کیوں نہ کیا گیا اور دشمن مسرور تھے کہ جماعت کے خلاف اتنا بڑا اقدام کیا گیا لیکن کُتّا تک نہ بھونکا۔ دوسرا راستہ پسپائی اور نگونساری کا تھا جس کی توقع، قادرِ مطلق کا شکر ہے نہ دوست رکھتے تھے نہ دشمن۔ تیسرا راستہ وہ راستہ تھا جو کم سے کم اس برصغیر کی حد تک تو آن جانا اور ان دیکھا تھا۔ یعنی عدالتوں کے ذریعہ حصولِ انصاف۔ جماعت نے جو ہمیشہ پامال راہوں سے گریزاں رہی ہے، اس نئے راستے کو اختیار کر لیا اور اپنے سلوک کے اس مقام پر پہنچ کر "سیاسی جنگ" کو "عدالتی جنگ" میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ دونوں صوبائی ہائی کورٹوں میں جماعت کو خلافِ قانون قرار دیے جانے کے خلاف اجرائے پروانہ کی درخواستیں (WRIT PETITIONS) دائر کر دی گئیں۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ مقدمات اور ان کے فیصلے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لحاظ سے بھی کہ ان میں جو دستوری اور قانونی نکات و مسائل زیرِ بحث آئے ہیں وہ قانون اور اس کی تعبیر پر دور رس اثرات چھوڑیں گے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ ان کی وجہ سے ملک میں قانون

(باقی ص ۷۲ پر)

(بقیّہ اشارات)

حضرات اپنی "ملازمت" کے لیے اگر کسی کے منت کش ہیں تو وہ ارکان ہیں نہ کہ مولانا مودودیؒ اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ ارکان کو نظر انداز کر کے مولانا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودی اگر عرصہ دراز سے امیر جماعت چلے آ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے سازشوں کے ذریعہ اپنے حامیوں کو بھاری بھر کم معاوضے دے دے کر اپنے حق میں رائے ہموار کر رکھی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مولانا ہی اس تحریک کے داعی ہیں۔ اُن کی دعوت پر ہی مسلمان مختلف حلقوں سے اس کی طرف ٹوٹ کر آئے ہیں۔ پھر مولانا نے ہی ہر قدم پر اس تحریک کی بڑی خوش اسلوبی سے رہنمائی کی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی غیر معمولی خوبیاں عطا کی ہیں۔ اُن کے اندر عزم و استقلال ہے، مشکلات سے نمٹنے کا حوصلہ ہے، اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جراُت ہے، اور ان سب سے بڑھ کر خداوند تعالیٰ نے انہیں علم دین کے اندر ایک خاص بصیرت بخشی ہے جس کے مطابق وہ موجودہ حالات پر اُس کی تعلیمات کو منطبق کر سکتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس میں یہ ساری صلاحیتیں یکجا ہوں۔ اس بنا پر ارکانِ جماعت انہیں کسی لالچ کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے منتخب کر لیتے ہیں۔ ہمیں کئی مرتبہ یہ بھی کہا گیا کہ ہم محض دکھلاوے کے لیے کسی دوسرے آدمی کو اپنا امیر منتخب کریں اور مولانا محترم اس کی رہنمائی کریں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ چیز غلط اور اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ جو شخص بھی جماعت کو فکری اور عملی رہنمائی دیتا ہے اُسے لازمی طور پر اس کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیے۔ ہم اسے منافقت سمجھتے ہیں کہ کوئی تحریک عملاً تو ایک شخص کی قیادت میں آگے بڑھے لیکن محض لوگوں کو

دکھانے کے لیے کسی دوسرے فرد کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا جائے۔ مولانا آج اگر اس تحریک کے سربراہ ہیں تو یہ اُن کی کسی سازش یا جوڑ توڑ کا نتیجہ نہیں اور نہ یہ اُن کے آمرانہ مزاج کی کرشمہ سازی ہے بلکہ اس کی بدیہی وجہ صرف ایک ہے کہ جماعت کے اندر صلاحیتوں کے اعتبار سے اُن کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اس تحریک سے جس قدر غیر معمولی لگن، اس سے جتنی گہری وابستگی اور اُن کے اندر جتنے بے مثال ایثار کا جذبہ موجود ہے وہ کسی دوسرے میں بظاہر نظر نہیں آتا۔ اس لیے رفقاء ہر انتخاب کے موقع پر اُنہی کی جامع صفات ہستی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا کسی اُونچے سرکاری منصب پر فائز نہیں کہ لوگ محض اُنہیں خوش کرنے کے لیے اُن کے حق میں رائے دیں۔ اُن کے پاس کوئی دولت کے ڈھیر نہیں کہ اُس کے حصُول کے لیے لوگ اُن کی خوشامد کریں۔ وہ اگر اُن کی طرف رجُوع کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہی اس وقت اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔

بعض حضرات جماعت کے اندر جس یک رنگی کو دیکھ کر اسے آمریت کا نام دیتے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جن جمہوری تحریکات سے وہ عام طور پر آشنا ہیں اُن کے اندر فکر و عمل کی وحدت نہ ہونے کی وجہ سے زبردست انتشار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات انتشار ہی کو جمہوریت کا ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ جماعت کے رفقاء ایک خاص نظم کے پابند ہیں، اُن کے فکر اور اُن کے عمل میں کافی حد تک یک رنگی پائی جاتی ہے، ان میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے مفقود ہیں، وہ آزادی کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ حرکات نہیں کرتے، تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کی قیادت آمرانہ رجحان رکھتی ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو کسی اصولی تحریک کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جو جماعت ایک ہمہ گیر انقلاب کا عزم لے کر اٹھی ہے وہ آخر اپنے اندر متضاد عناصر کیسے جمع کر سکتی ہے۔ وہ جہاں اسلام دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہو گی وہ اس بات کی

بھی پوری طرح فکر کرے گی کہ اُس سے وابستہ ہونے والے لوگوں کے اندر فکر و نظر، جذبۂ احساس اور فعل و عمل کی وحدت ہو۔ البتہ اس بات کا پُورا پُورا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس وحدت میں جکڑ بندی کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے، بلکہ افراد اپنی خداداد صلاحیتوں کے اختلاف کے باوجود ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے ایک عظیم نصب العین کی بنیاد پر ہم رکاب ہو کر آگے بڑھیں۔ اس صحیح اور فطری اتحادِ فکر و عمل کو اور اس صحت مند نظم و ضبط کو آمریت کہنا انتہائی درجے کی سادگی ہے۔ یہ وحدت آمرانہ رجحانات کا نتیجہ نہیں بلکہ صحیح تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہے۔

ہم اپنی بات ختم کرنے سے پہلے جماعت کے ہمدردوں اور متاثرین کے بارے میں بھی ایک وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق بعض معترضین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان حضرات سے خدمت تو لی جاتی ہے لیکن انہیں رائے کا حق نہیں دیا جاتا۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ ہمارے ان متفقین میں سے بعض سیرت و کردار کے اعتبار سے کئی ایک ارکان سے بھی برتر ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر انہیں مقصد سے عشق ہے، وہ جماعت اسلامی کے طریقِ کار کو صحیح سمجھتے ہیں اور اُن ساری ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو ارکان پر عائد ہوتی ہیں، تو آخر انہیں رکنیت اختیار کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔ مَیں نے بارہا اپنے ایسے واجب الاحترام دوستوں سے اس کی وجہ دریافت کی اور ان میں سے بعض کو یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو ارکان پر عائد ہوتی ہیں، تو آخر انہیں رکنیت اختیار کرنے میں کونسی چیز مانع ہے مَیں نے بارہا اپنے ایسے واجب الاحترام دوستوں سے اس کی وجہ دریافت کی اور ان میں سے بعض کو یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ بھی کرنا چاہا لیکن ان سب نے یہی کہا کہ وہ بعض مجبوریوں کی بنا پر "رکنیت کا خطرہ" مول لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے جماعت کے نظم سے باہر رہ کر ہی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی کہ انہیں رائے دہی کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اُن میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اگر وہ ارکان کے

دائرہ میں شامل نہیں ہو رہا تو اس میں جماعت کسی لحاظ سے بھی مانع نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنی مجبوریوں کی بنا پر ایسا کر رہا ہے۔ یہ حضرات بلاشبہ جماعت کے لیے بےحد مفید اور کارآمد ہیں۔ امیرِ جماعت سے لیکر معمولی سے معمولی کارکن تک کی نگاہ میں ان کی عزت و تکریم ہے۔ لیکن آخر جماعت کی پالیسی بنانے میں انہیں کس طرح براہِ راست شریک کر لیا جائے جبکہ اُس کے نفاذ کی عملی ذمہ داریوں میں وہ پوری طرح شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ اگر ووٹ کے حق سے محروم ہیں تو یہ قیادت کی کسی سازش یا کسی مخصوص مفاد کی حفاظت کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی اپنی صوابدید کا نتیجہ ہے۔ وہ جب چاہیں رکنیت قبول کر کے نہ صرف ووٹ دینے کے مجاز ہو سکتے ہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر جماعت کے اندر اونچے سے اونچا منصب بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جماعت اسلامی جس روز بنی تھی، اسی روز یہ اصول طے ہو گیا تھا کہ جماعت میں فیصلے کرنے کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہوگا جو ان فیصلوں پر عملدرآمد کرنے کی ذمہ داری بھی ساتھ ساتھ قبول کریں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جو نہ نظمِ جماعت کی پابندی اختیار کریں، اور نہ ذمہ داریاں اٹھانے میں شریک ہوں، بلکہ صرف باہر سے اتفاق اور ہمدردی کرنے والے ہوں، تو اپنی مرضی سے جو تعاون بھی کریں، ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں، لیکن یہ حق انہیں نہیں دیا جا سکتا کہ فیصلے تو وہ کر دیں۔ مگر ان پر عملدرآمد کی ذمہ داری اٹھائیں صرف ارکانِ جماعت۔

(بقیہ مطبوعات)

کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور بے لاگ انصاف کی روایات قائم ہوئی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں جناب تنزیل الرحمٰن صاحب نے ان مقدمات کی رُوداد پیش کی ہے اور فیصلوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں دو امور نے بڑی افادیت پیدا کر دی ہے۔ ایک تو یہ کہ ذریعۂ بیان اُردو کو بنایا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ طویل قانونی بحثوں کا ملخص نہایت سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قانون کے طالب علم اور ملک کے پڑھے لکھے افراد اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔
(ع۔ ف)

دین کا شعور پیدا کرنے کے لیے بے مثل کتب

دینیات
سید ابو الاعلیٰ مودودی

- اسلام کے بنیادی عقائد اور بنیادی احکام کی توضیح۔
- نئی نسل خصوصاً طلبا کو دین کا شعور بخشنے کیلئے بیمثال کتاب
- جس کا ۱۸ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔
- جس کی سوا لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

قیمت مجلد ۲٫۵۰ روپے سستا ایڈیشن ۱٫۷۵ روپے

خطبات
سید ابو الاعلیٰ مودودی

- اسلام کے بنیادی ارکان پر عصرِ حاضر کی عظیم ترین تالیف
- اسلام کی بنیادی عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی برکات، اہمیت، حکمت اور فلسفہ کی مفصل اور مدلل تشریح۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴٫۵۰ روپے
سستا ایڈیشن ۳٫۰۰ روپے
پانچ حصوں میں علیحدہ علیحدہ ۲٫۷۸ روپے

اسلامی نظامِ زندگی
اور اس کے بنیادی تصورات

سید ابو الاعلیٰ مودودی

- اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب۔
- فکر انگیز اور بصیرت افروز تقاریر و مقالات کا مجموعہ
- دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی کتاب

آفسٹ کی حسین طباعت

قیمت مجلد اعلیٰ ایڈیشن ۷٫۵۰ روپے

تفہیمات
سید ابو الاعلیٰ مودودی

- اسلام کی روشنی میں چند اہم مسائلِ زندگی کی دل نشین تفہیم۔
- نبوتِ محمدیؐ کے اثبات۔ اتباع و اطاعت پر سیر حاصل بحث
- مختلف اہم موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح

آفسٹ کی حسین طباعت پر نیا ایڈیشن

قیمت حصہ اول سستا ۶٫۰۰ روپے حصہ دوم سستا ۷٫۰۰ روپے

نشری تقریریں
سید ابو الاعلیٰ مودودی

- آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان سے نشر کردہ تقاریر کا مجموعہ۔
- مختصر ترین مگر جامع الفاظ میں اسلامی حقائق کا بیان
- اسلامی موضوعات پر مقررین کے لیے ایک رہنما کتاب

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲٫۰۰ روپے سستا ایڈیشن ۱٫۲۵ روپے

اسلام ایک نظریہ
صدر الدین اصلاحی

- اسلام کے جملہ پہلوؤں کا جامع بیان
- آسان انداز میں اسلام کے ضروری مسائل کی عملی نقطۂ نظر سے تشریح۔
- دل نشین اندازِ بیان۔ پُرزور استدلال

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۵٫۰۰ روپے سستا ایڈیشن ۲٫۷۵ روپے

فون = ۶۸۳۴۱

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ○ شاہِ عالم مارکیٹ ○ لاہور